مُجاہد

رئیس احمد جعفری

کتاب منزل کشمیری بازار، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

سلسلہ مطبوعات نمبر ۳۷

مصنّف	رئیس احمد جعفری
طابع	شیخ نیاز احمد
مطبع	علمی پرنٹنگ پریس، لاہور
ناشر	کتاب منزل، لاہور
اشاعت	تیسری ۱۹۵۸ء
قیمت	پانچ روپے
کاتب	عبدالستار، لاہور

شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر نے علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور میں طبع کرا کے کتاب منزل کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا۔

فہرس

۱	منچلا سپاہی	۹	۱۶	تاثرات	۱۴۵
۲	ہیرے کی انگوٹھی	۱۳	۱۷	مشاعرات	۱۵۵
۳	نیا محبوب	۱۹	۱۸	نغمۂ شادی	۱۶۷
۴	عجیب و غریب واقعہ	۲۵	۱۹	خطرہ	۱۷۹
۵	اقبال کا مورچہ	۳۵	۲۰	نوحۂ غم	۱۸۷
۶	ذکر اس پری وش کا	۴۱	۲۱	پھر سفر	۲۰۳
۷	اللہ یہ ہی ہیں جن کو ترس گیا ہوں	۵۱	۲۲	منہ بولا بھائی	۲۱۳
۸	چاندنی رات	۶۱	۲۳	عورت پھر عورت ہے	۲۲۱
۹	گرم گرم باتیں	۷۹	۲۴	تلاش یار	۲۴۱
۱۰	نیا واقعہ	۸۹	۲۵	رٹا کا	۲۵۷
۱۱	آگ	۹۹	۲۶	نو وارد	۲۶۷
۱۲	پیار کی باتیں	۱۰۷	۲۷	فریاد	۲۷۵
۱۳	ماتم	۱۱۵	۲۸	بیتی ہوئی باتیں	۲۸۹
۱۴	زلیخا	۱۲۵	۲۹	سعی ناکام	۲۹۹
۱۵	ایک اور حادثہ	۱۳۳	۳۰	غم بھی اور خوشی بھی	۳۰۵

۳۱	میدانِ قیامت	۳۱۷	۳۷	ہنگامہ آرائی	۳۷۹
۳۲	قومی جنگ	۳۳۷	۳۸	زنانہ جیل	۳۸۷
۳۳	بھائی بہن	۳۴۸	۳۹	اُمید کے گھروندے	۳۹۷
۳۴	سپاہی کی گرفتاری	۳۵۹	۴۰	تباطوفان	۴۰۷
۳۵	صلیبی جھنڈے سے اُوپر	۳۶۵	۴۱	بازی اگرچہ لے نہ سکا، سر تو دے سکا	۴۱۷
۳۶	تشدد	۳۷۳			

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

(اقبال)

نئی داستان

اس ناول میں آہوں اور آنسوؤں کی داستان ہے

انسان میں اور درندے میں زمین و آسمان کا فرق ہے، لیکن جب انسان بہیمیت کا لباس پہن لیتا ہے تو درندے بھی سہم جاتے ہیں، زمین و آسمان لرزنے لگتے ہیں۔ عرش و فرش میں تہلکہ مچ جاتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان اب تک تین مرتبہ درندگی اور بہیمیت کے شکار بن چکے ہیں۔ پہلی بار بہار میں، دوسری مرتبہ مشرقی پنجاب میں، اور تیسری بار دہلی میں، ظلم، سفاکی، شقاوت اور بربریت کے جو مظاہرے ان مقامات پر انسانوں نے انسانوں کے ساتھ روا رکھے، ان کی مثال جنگل اور بیابان بھی نہیں پیش کر سکتے، جہاں وہ مخلوق بستی ہے، جسے ہم حقارت سے جانور کہتے ہیں۔

مجاہد، ان مصائب سہ گانہ کی پہلی کڑی ہے، یہ ناول بھی ہے اور تاریخ بھی، حقیقت بھی ہے اور افسانہ بھی، افسانہ تاریخ کے رنگ میں اور تاریخ افسانہ کی زبان میں،

اس سلسلہ کے دوسرے ٹکڑے بھی اپنے وقت پر پیش کیے جائیں گے۔

رئیس احمد جعفری

بمبئی۔ ۲۱ جون ۱۹۴۷ء

"مجاہد" نے قلیل عرصہ میں جو مقبولیت حاصل کی، اس سے اندازہ ہوا، کہ آزادیٔ ملک سے پیدا شدہ حالات کا ہمارے عوام پر بہت گہرا اثر ہے مجاہد کی اشاعت اوّل سے قبل اسی موضوع پر کئی ایک کتابیں مارکیٹ میں آچکی تھیں، لیکن جیسے ہی "مجاہد" میدان میں آیا، بڑے بڑے شہسواروں کا دم پھولنے لگا، رئیس احمد جعفری ادبی دنیا کا درخشندہ ستارہ ہے۔ جس کی آب و تاب سے ہمارے ادب میں ایک نئی روح کارفرما ہے، یہی وجہ ہے کہ رئیس احمد جعفری کی تحریر ہر طبقہ میں مقبول ہے۔

جیسا کہ اس ناول کے آخیر میں فاضل مصنّف نے اعلان کیا تھا کہ وہ اس سلسلہ کی دوسری کڑیاں عنقریب پیش کرے گا۔ "ایک مہاجر" کے نام سے دوسری کتاب پیش کی جا چکی ہے جو "مجاہد" کی طرح ہی مقبول عام ہوئی۔ "مجاہد" تیسری دفعہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر پیش خدمت ہے۔

ناشر

منچلا سپاہی

وہ سنگاپور کے مورچہ پر دادِ شجاعت دیتا ہُوا گرفتار ہو گیا۔
انگریزوں نے جب ہتھیار ڈالے، تو ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سپاہیوں اور سورماؤں کو بھی، جاپانی کمانڈر کی خدمت میں تحفۂ عقیدت کے طور پر پیش کر دیا، اور ان ہندی سپاہیوں سے جو اب تک انگریزوں کے پہلو بہ پہلو پوری بہادری کے ساتھ جاپانیوں سے لڑ رہے تھے، کہہ دیا آج سے تم ہمارے نہیں جاپانیوں کے غلام ہو۔ تنویر سے برداشت نہ ہو سکا، وہ وہیں تلوار سونت کر کھڑا ہو گیا، اس نے کہا ہم ہندوستانی مالِ تجارت نہیں ہیں کہ ایک دوکان سے دوسری دوکان میں، ایک سوداگر کی گٹھڑی سے دوسرے سوداگر کے گودام میں منتقل ہوتے رہیں۔ ہم نے میدانِ جنگ میں قدم ہتھیار ڈالنے کے لیے نہیں رکھا تھا، دشمن کی گردن کاٹنے، یا اپنی جان دے دینے کا عہد کر کے ہم میدان میں آئے تھے۔ یہ تلوار اس وقت تک چلتی رہے گی، جب تک اس میں اور میرے ہاتھوں میں دم ہے۔

انگریز کمانڈر نے شرم سے گردن جھکالی، جاپانی کمانڈر نے حیرت سے اس منچلے نوجوان کو دیکھا، مسکراتا ہوا آگے بڑھا، قریب آکر شفقت سے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"نوجوان! میں تمھاری ہمّت اور حوصلہ کی قدر کرتا ہوں، تم اپنے سفید فام آقاؤں سے زیادہ بہادر نکلے، لیکن اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا، تم جاپانی امپائر کو شکست نہیں دے سکتے، جاپانی خدا کے بیٹے ہیں، وہ قیامت تک نہیں ہاریں گے، انھوں نے انگریزوں کو شکست دی ہے، وہ واشنگٹن پر اپنا جھنڈا لہرائیں گے، لیکن ہندوستان پر نہیں، وہ ہمارا ہمسایہ ملک ہے، ہم اس سے دوستی قائم رکھنا چاہتے ہیں، اگر تم میں بہادری ہے، حوصلہ ہے، اُمنگ ہے، لڑنے اور مرنے کا جذبہ ہے، تو اُس کا صحیح استعمال کرو، تمھارا پیارا وطن، آج غلام ہے، تم اس کی آزادی کے لیے لڑو! ہم تمھاری مدد کریں گے، ہتھیار دیں گے، روپیہ دیں گے، سپاہی دیں گے، جو مانگو گے وہ پاؤ گے، ہم تمھارے دوست ہیں، انگریز تمھارے دشمن ہیں، ہم سے کیوں لڑتے ہو؟ انگریز سے کیوں نہیں لڑتے؟ _____"

تنویر کی آنکھیں کھل گئیں، وہ اپنے انگریز آقاؤں کو سرنگوں دیکھ رہا تھا، اور ان سرنگوں آقاؤں پر اُسے غصّہ آرہا تھا، یہ اس قوم کے فرد ہیں جو سو برس سے ہندوستان پر قابض ہیں، اس کی دولت لوٹے لیتے ہیں، اسے اپنا غلام بنائے ہوئے ہیں، ہندوستان دنیا کا سب سے

زیادہ خوش قسمت ملک ہوتا۔ اگر انگریز اس کے مالک نہ ہوتے، یہی ہیں جنھوں نے دھوکے سے اور فریب سے ہندوستان کو غلام بنا لیا، یقیناً یہ اس کے مستحق ہیں کہ ان سے جنگ کی جائے، تنویر جاپانی کمانڈر کے حضور میں اپنی خدمات پیش کرنے کا اعلان کرنے ہی والا تھا کہ دفعتاً اس کی آنکھوں کے سامنے، غریب اور مظلوم چین کا نقشہ آ گیا، اس کے کانوں میں وہ بم باریاں گونجنے لگیں، جو چین کے امن پسند اور بے گناہ شہریوں پر سالہا سال سے کی جا رہی تھیں، اس کی نظر کے سامنے تڑپتے ہوئے بچوں، بھاگی ہوئی عورتوں، زخمی اور نیم جان نوجوانوں کی تصویر پھر گئی جو وطن کی آزادی کے لیے بے سر و سامانی کے باوجود صف آرا تھے، جاپان، چین سے اس لیے لڑ رہا تھا کہ اسے اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے شہروں کی ضرورت تھی، اسے اپنے مال تجارت کے لیے منڈیوں کی ضرورت تھی، اسے اپنی سامراجی حکمت عملی کو کامیاب اور پائیدہ تر بنانے کے لیے نو آبادیوں کی ضرورت تھی، جو جاپان، محض جوع الارض سے مجبور ہو کر چین کی اینٹ سے اینٹ بجا رہا ہے، ہندوستان کو کیوں چھوڑ دے گا؟ سامراجی ممالک کے لیے ہندوستان، چین سے کہیں زیادہ کشش رکھتا ہے، اس کی سونا اگلنے والی زمین، اس کے معدنیات، اس کی اشیاء خام کون چیز ہے، جس پر جاپان کی رال انگریزوں سے زیادہ بے تکلفی کے ساتھ نہ ٹپک پڑے گی؟ یہ خیال آتے ہی رائے بدل گئی، اس نے حقارت کے ساتھ جاپانی کمانڈر پر، ایک نظر ڈالی اور جرأت کے ساتھ کہا۔

"لیکن آپ میں اور انگریزوں میں کیا فرق ہے ؟"

"فرق ؟ وہ تمھارے دشمن ہیں، ہم دوست ہیں !"

"لیکن ہندوستان سے زیادہ چین آپ کی دوستی کا محتاج ہے ! آپ اس سے دوستی کی پینگ کیوں نہیں بڑھاتے ؟"

یہ سُنتے ہی جاپانی کمانڈر کا چہرہ غصّہ سے سُرخ ہو گیا، اس نے قہر آلود نگاہ اپنے سپاہیوں پر ڈالی اور وہ اشارہ پاتے ہی، تنویر پر ٹوٹ پڑے، آن کی آن میں اسے گرفتار کر لیا، ہتھیار چھین لیے، اور مشکیں باندھ کر ایک کونہ میں کھڑا کر دیا۔

جاپانی کمانڈر نے تنویر پر ایک حقارت کی نگاہ ڈالی اور قہقہہ لگا کر پُوچھا۔

"چین کو رضا کاروں کی شدید ضرورت ہے، اگر کہو تو تمھارا پارسل جنرل چیانگ کائی شیک کے پاس بھیجدیا جائے"

پھر اس نے ایک زور کی ٹھوکر تنویر کے لگائی، اور آگے بڑھ گیا۔

ہیرے کی انگوٹھی

تنویر قیدیوں کے ایک کیمپ میں رکھا گیا، جہاں ہزاروں ہندوستانی سپاہی قید تھے، یہاں آکر معلوم ہُوا کہ جاپانی کتنے ظالم ہوتے ہیں، انھیں ہندوستانیوں سے کتنی ہمدردی ہے، اس کیمپ میں جتنے قیدی تھے، سب سے ۱۲، ۱۲ گھنٹہ بلکہ ۱۴، ۱۴ گھنٹہ کام لیا جاتا تھا، کام بھی معمولی نہیں، بلکہ نہایت سخت اور محنت طلب، زمین کی کھدائی، سڑکوں کی مرمت، نئے نئے راستوں کی تعمیر، یہ سارے کام ہندوستانی قیدیوں کو کرنا پڑتے تھے چلچلاتی دھوپ میں انھیں گھنٹوں اور پہروں مصروف رہنا پڑتا تھا، ذرا بھی سست پڑے، یا تھکے فوراً جاپانی محافظ کے کوڑے برسنے لگے، سنگینیں چلنے لگیں، ہر روز کئی کئی قیدی ان سختیوں کی تاب نہ لاکر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے، فوراً دوسرے قیدیوں کو حکم ملتا تھا کہ گڑھا کھودیں اور اپنے مظلوم اور بے گناہ ساتھیوں کو دفن کر دیں، نہ نماز جنازہ، نہ غسل میّت، نہ کریا کرم نہ چتا۔

اس کیمپ میں بہت سے قیدی ایسے تھے، جو بیمار تھے، کمزور تھے، بوڑھے تھے، ان کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں تھی، جن کے بارے میں یقین ہو جاتا کہ ان کی بیماری طول کھینچے گی، انھیں بے تامل کھڑے کھڑے گولی مار دی جاتی ان نو گرفتاروں میں کچھ انگریز بھی تھے، مرد بھی اور چند عورتیں بھی، انگریز

عورتوں کے ساتھ دن میں، اور رات میں، کئی کئی بار علانیہ، اور خفیہ، منہ کالا کیا جاتا، مگر کس کی مجال تھی کہ دم مارتا، سب آنکھوں سے یہ لرزہ خیز مناظر دیکھتے اور خاموش رہتے، کسی نے اگر ذرا بھی چوں کی، فوراً اس کا کاسۂ سر زمین پر پھڑکتا ہوا نظر آیا، جان لینے کے طریقے بھی انوکھے اور نرالے تھے، کسی کا خاتمہ تلوار سے کر دیا گیا، کسی کے لیے سنگین کافی سمجھی گئی، زیادہ رحم آیا تو بندوق کی نالی سے کام لیا گیا، زیادہ خفا ہوئے تو پہلے ہاتھ پاؤں کاٹے، پھر بجلی کا تار لگا کے روح کھینچ لی، جی چاہا دفن کرا دیا، ورنہ دوسرے قیدیوں کی عبرت اور سبق آموزی کے لیے لاش درخت میں لٹکا دی، یہ لٹکی ہوئی لاشیں آئینہ کا کام کرتی تھیں، اس قدِ آدم آئینہ میں کیمپ کا ہر قیدی، اپنے مستقبل کا نظارہ کر سکتا تھا۔

ہندوستانیوں کے بارے میں شاید جاپانی آقاؤں کا یہ خیال تھا کہ یہ لوگ کھانا کھائے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں، دو وقت کے کھانے کا تو کبھی سوال ہی نہیں پیدا ہوا، یہ اتنی انہونی بات تھی کہ اس پر غور و فکر کرنے کی ایک لمحہ کے لیے بھی ضرورت نہیں محسوس کی گئی، ایک وقت جو کھانا ملتا تھا، اسے بھی کھانا کہنا، بڑی زیادتی ہے، دال، ترکاری، گوشت، شکر، چائے، گیہوں، یہ سب چیزیں فرض کر لیا گیا تھا کہ اگر ہندوستانی کھائیں گے، تو ہضم نہیں کر سکیں گے صرف اُبلے ہوئے چاول ۲۴ گھنٹہ میں کسی وقت مل جاتے تھے، اور وہ بھی اتنے نہیں کہ پیٹ بھر جائے، صرف اتنے کہ چند لقمے کھا کر بھوک کی اذیت کا لطف لیا جائے، اس "راتب بندی" کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو موٹے تھے وہ دُبلے ہونے لگے، جو دُبلے تھے وہ گھلنے لگے، جو نیم جان تھے وہ قبر میں پہنچ گئے، جو توانا

تھے، وہ نیم جانی کا لطف اٹھانے لگے۔

تنویر بڑا مضبوط اور تنومند نوجوان تھا، کیمپ میں پہنچنے کے چند روز بعد وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا، آدمی تھا جیالا، کمزوری اور نقاہت کے باوجود، اپنے فرائض بڑی مستعدی سے ادا کرتا تھا۔

چند روز سے ایک نیا محافظ اس کیمپ کی نگرانی پر مامور ہوا تھا، اس کے پاس ڈبل روٹیوں، کیک، پیسٹری اور مٹھائی کا معقول ذخیرہ ہر وقت رہتا تھا، یہ قیدیوں کی سونے کی گھڑیاں، قیمتی فاؤنٹین پین، طلائی بٹن، بہترین قسم کے چسٹر، جوتے، کوٹ، پتلون، جو چیز چاہتا تھا، پسند کر لیتا تھا اور اپنے تھیلے میں سے نکال کر کسی کو ایک ڈبل روٹی دے دیتا، کسی کو مٹھائی یا کیک کا ایک ٹکڑا، لوگ کھانے کو اتنے ترس چکے تھے کہ بڑی خوشی سے سینکڑوں روپیہ کا مال، ایک مٹھائی کی ڈلی، یا ایک ڈبل روٹی، یا کیک کے ایک ٹکڑے کے بدلہ میں دے دیا کرتے تھے، تنویر سے بھی محافظ نے اس کی ساری قیمتی چیزیں اسی طرح لے لیں۔

اب نہ تنویر کے پاس کوئی فاؤنٹین پن رہ گیا تھا نہ گھڑی صرف ایک سونے کی انگوٹھی رہ گئی تھی، اس میں ہیرے کا نگینہ جڑا تھا، محافظ نے کئی دفعہ للچائی ہوئی نظر انگوٹھی پر ڈالی، لیکن خاموش ہو گیا، ایک روز اس نے کہا،

"ہم یہ انگوٹھی مانگتا!"

تنویر نے جواب دیا۔

"ہم نہیں دینے سکتا!"

"کیوں؟ دو ڈبل روٹی لے گا؟"

"نہیں!"

"اچھا تین؟"

"وہ بھی نہیں!"

"لو ہم پانچ دیلے دیتا ہے!"

"پانچ سو بھی نہیں!"

محافظ کو غصّہ تو آیا لیکن وہ خلاف عادت ضبط کر گیا، کچھ دیر تک خاموش رہا، پھر مسکرا کر جیب سے، سگریٹ کی ایک ڈبیہ نکالی اور کہا۔

"ایسا ایسا، کئی ہم دے گا، بولو منظور؟"

"نامنظور"

محافظ جنگ کے بجائے اب تک سمجھوتہ پر مائل تھا، اس نے اپنا تھیلہ کھول کر تنویر کے سامنے رکھ دیا اور بڑی ہمدردی کے لہجہ میں کہا،

"جو کچھ مانگتا لے لو"

"کچھ نہیں مانگتا"

اب محافظ کا پیمانۂ صبر چھلکنے کے قریب تھا، لیکن اس نے اپنے تئیں سنبھالا اور بڑی نرمی سے کہا۔

"اچھا، یہ سب لینا مانگتا؟ سب لے لو"

تھیلہ اس نے تنویر کی طرف بڑھا دیا، اس نے یہ گنجِ گراں بہا قبول کرنے

سے انکار کر دیا، محافظ نے سیٹی بجائی، فوراً ایک درجن کے قریب جاپانی سپاہی آموجود ہوئے، جو اشارہ پاتے ہی ٹوٹ پڑے، سامنے ایک درخت تھا، اس کے تنہ سے تنویر کو جکڑ دیا گیا، پھر اس کا ہاتھ کلائی سے درخت کی ایک مضبوط شاخ سے باندھ دیا گیا، اب محافظ نے تلوار میان سے نکالی اور اس صفائی سے ہاتھ مارا کہ انگوٹھی والی انگلی مع انگوٹھی کے زمین پر گر کے پھڑپھڑانے لگی، محافظ نے نشۂ کامیابی سے مست ہو کر ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا، تڑپتی ہوئی انگلی سے انگوٹھی نکالی، جیب میں رکھی اور انگلی پھر زمین پر پھینک دی، لیکن اب اس کی روح نکل چکی تھی اور وہ ایک کٹی ہوئی شاخ کی طرح زمین پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ تنویر کے ہاتھ سے خون کا فوارہ بہہ رہا تھا، اور وہ بے بسی کے ساتھ درخت کے تنہ سے چمٹا ہوا تھا، بیہوش

——— بے حس و حرکت ———

کیمپ کے ساتھی قیدیوں نے یہ جگر خراش منظر روتے ہوئے دل اور مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے دیکھا، اگر کسی قیدی پر ہمدردی کا شبہ بھی ہو جاتا، تو اس کی بھی وہی گت بنتی جو تنویر کی بن چکی تھی۔

تنویر بے ہوش تھا، لیکن اس کا دل دھڑک رہا تھا، اور یہ دھڑکتا ہوا دل زبانِ درد بن کر، نزہت سے کہہ رہا تھا، دیکھو میں تمھیں کتنا پیار کرتا ہوں، کتنا چاہتا ہوں تمھیں، چلتے وقت نشانی کے طور پر، اپنے نازک ہاتھوں سے جو انگوٹھی تم نے میری انگلی میں پہنائی تھی، اسے آج تک میں نے اپنی انگلی سے جدا نہ ہونے دیا، اور آج جب وہ جدا ہوئی، تو اس کے ساتھ اپنی انگلی

بھی میں نے قربان کردی ——— نزہت اگر میں بے بس اور نہتّہ نہ ہوتا تو جان تک قربان کر دیتا، لوگ مرنا کتنا آسان سمجھتے ہیں، لیکن مجھے دیکھو، ہر روز موت کا مزہ چکھتا ہوں، لیکن مر نہیں سکتا، مرنا چاہتا بھی نہیں، جب تک تم سے ملنے کی آس ہے، مرنے کی تمنا کس دل سے کروں؟ کیسے کروں؟

اور جاپانی محافظ کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا، گویا کہہ رہا تھا، تم بھی کتنے بیوقوف ہو کیپٹن تنویر، اس کیمپ میں نہ جانے کتنی گوری اور کالی عورتیں ہیں، جو ایک ڈبل روٹی کے لیے رات بھر میرا پہلو گرم رکھتی ہیں، بہت سے مرد ہیں جو کیک کے ایک ٹکڑے اور سگریٹ کی ایک ڈبیہ کے لیے اپنی بیویوں کو خود میرے خیمے تک چھوڑ جاتے ہیں، اور ایک تم ہو کہ ذرا سی انگوٹھی کی خاطر اپنی انگلی تک کٹا لی۔

پھر اس نے انگوٹھی کے چمکتے ہوئے ہیرے کو دیکھا، اور ایک تبسّم کے ساتھ اپنی جیب میں رکھ لیا، اس نے طے کر لیا تھا کہ یہ انگوٹھی اپنی محبوبہ، اپنی منگیتر کی خدمت میں تحفہ کے طور پر پیش کرے گا اور کہے گا، یہ ہیرے کی انگوٹھی ایک بیوقوف انسان کے خون کا غسل کر کے تمھاری مرمریں اور نازک انگلی تک پہنچی ہے، کتنی خوش ہو گی وہ اپنے ہونے والے شوہر کی بہادری کا یہ کارنامہ سُن کر!

نیا محبوب

تنویر کو قیدیوں کے کیمپ میں رہتے ہوئے کئی مہینے ہو چکے تھے، وہ ناقابل برداشت محنت اور فقر و فاقہ کے سبب کمزور ہوتا جا رہا تھا، اب اسے اپنی رہائی بلکہ زندگی سے مایوسی ہو گئی تھی، وہ موت سے ذرا بھی خائف نہیں تھا البتہ صرف ایک مرتبہ، اپنے دل کی رانی نزہت کو دیکھ کر، اس کے پیارے اور دل فریب مکھڑے پر الوداعی نظر ڈال کے وہ اس دنیا سے رخصت ہونا چاہتا تھا، لیکن آہ کہ اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔

ایک روز کیمپ کی فضا بدلی ہوئی نظر آئی، سارے کیمپ کی صفائی کرائی گئی، قیدیوں کو اچھے اور دھلے ہوئے کپڑے پہننے کو دیے گئے، آج کھانا بھی ذرا اچھا ملا، یعنی چاول کے ساتھ ایک ایک روٹی بھی تھی اور مکھن بھی، اور آلو کی ترکاری بھی، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہی محافظ جو کل تک کیمپ کے قیدیوں کے لیے شمشیر برہنہ بنا ہوا تھا، آج سب سے ہنس ہنس اور مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا، جیسے یہ غصہ کرنا جانتا ہی نہیں، جیسے یہ بے گناہوں کے پیٹ میں سنگین اور سینہ میں تلوار کی نوک چبھونے کے فن سے واقف

ہی نہیں، سب کو حیرت تھی، تلوار اگر ریشم بن جائے تو کس کو حیرت نہ ہوگی؟

سہ پہر کے قریب ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی آنے والا ہے، اور اس کے استقبال کی تیاریاں اہتمام اور تردّد کے ساتھ ہو رہی ہیں، محافظ کی نگاہ بار بار سڑک پر، کسی کے تجسّس میں جاتی تھیں اور ناکام لوٹ آتی تھیں۔

دفعتہً، فوجی موٹروں کا ایک قافلہ آتا ہُوا دکھائی دیا، اگلی موٹروں میں جاپان کے حکام تھے، پچھلی موٹروں سے ہندوستانی سپاہی مسکراتے ہوئے اُترے، بیچ کی موٹر سے ایک دراز قد، گداز بدن، بڑی بڑی آنکھوں والا، خوب صورت چہرے والا شخص دودھ کے سے سفید کھدّر میں ملبوس، چپل پہنے، دھوتی باندھے، کھدّر کی چادر اوڑھے ہوئے اترا، دفعتہً فضا میں "جے ہند" کا نعرہ بلند ہُوا، جاپانی اور ہندوستانی سپاہیوں نے اسے سلامی دی، وہ وقار کے ساتھ سلام کا جواب دیتا اور مسکراتا ہُوا آگے بڑھا ——

یہ تھے نیتاجی سوبھاش چندر بوس۔

نیتاجی آئے، انھوں نے کیمپ کے ہندوستانی سپاہیوں پر ایک نظر ڈالی اور تقریر شروع کر دی،

"بھائیو! غلام ہندوستان کے سانتو اور مجاہدو!

میں جانتا ہوں تم بہادر ہو، تم موت سے نہیں ڈرتے، تم اس دیس میں لڑنے اور جان دینے کے لیے آئے تھے، یہ اتفاق کی بات ہے کہ تم لڑ نہ

سکے، جان نہ دے سکے، گرفتار ہو گئے۔

لیکن اس سے تمھاری بہادری پر حرف نہیں آتا، تم اب تک غلط راستہ پر تھے، میں صحیح راستہ دکھانے آیا ہوں، اب تک تم بدیشی سامراج کے لیے اپنا خون بہاتے تھے، میں تمھیں دعوت دیتا ہوں کہ آؤ اپنے مقدّس اور پیارے وطن پر قربان ہونے کے لیے میدان میں اُتر پڑو، آج پرتھوی راج اور اکبر کا ملک، رام موہن رائے، گرو نانگ اور خواجہ معین الدین اجمیریؒ کا وطن تم سے، اپنے سپوتوں سے بھیک مانگ رہا ہے، وہ غلام ہے تم اسے آزاد کرا سکتے ہو، وہ تباہ حال ہے، تم اسے خوش حال بنا سکتے ہو، وہ غیر ملکی سامراج کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، تم یہ زنجیریں کاٹ سکتے ہو، تمھاری جنگ جوئی اور بہادری کا ہدف جاپان کو نہیں انگریز کو بننا چاہیئے جاپان نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟ کچھ بھی نہیں، اور انگریز وہ ہے جس نے تمھاری سلطنت کا تختہ الٹ دیا جس نے تمھارے سونے اور چاندی کے بھرے ہوئے خزانوں کو لوٹ لیا، جس نے تمھاری تجارت چھین لی، جس نے تمھیں جہالت، بیروزگاری اور مفلسی تحفہ میں بخشی اور تمھارے بل پر خود عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگا، یہ وہ ظالم ہے جس نے گاندھی جیسے مہاتما کو جیل میں بند کیا جس نے محمد علی جیسے مجاہد کو بیڑیاں پہنائیں، جس نے نہرو جیسی خالص ہندو ریاست کو غلام بنا لیا، جو آج بھی فلسطین جیسے مقدس مقام پر زبردستی قابض ہے، میں کہتا ہوں بہادرو اگر تم میں ذرا بھی غیرت ہے، حبِ وطن ہے، اپنے وطن کو سربلند، آزاد اور خود مختار دیکھنے کی تڑپ

ہے، تو آج یہ تہیہ کرلو کہ تمھیں انگریز سے صرف انگریز سے لڑنا ہے، اور جب تک تم یہ جنگ جیت نہیں جاؤ گے، اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھو گے۔

جاپان ہمارا دوست ہے، وہ ہندوستان جیسے بڑے ملک کو غلام بنا بھی نہیں سکتا، وہ انگریزوں کی دشمنی میں ہماری مدد کرنا چاہتا ہے ہمیں موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے، اور جاپان کی مدد قبول کرکے اپنے حقیقی، اصلی اور پرانے دشمن سے گتھ جانا چاہیئے، جاپان ہم سے دشمنی نہیں کرسکتا وہ ہمیں غلام نہیں بنا سکتا، لیکن اگر کبھی اس کی نیّت میں فتور آیا تو ہم لڑیں گے اور اپنے وطن کی مقدس سرزمین اس سے خالی کرالیں گے۔

اگر تم یہ چاہتے ہو کہ جاپانی فوجیں ہندوستان کی سرزمین میں نہ داخل ہوں، تو یہ بھی ہوسکتا ہے، حکومت جاپان کو میں نے بتادیا ہے کہ ہمیں صرف سامانِ جنگ چاہیئے، روپیہ کا ہم نے خود انتظام کرلیا ہے، فوجیں ہمارے پاس اپنی کافی ہیں، میں بہت جلد ہندوستان پر ہندوستان کے سپاہیوں کو لے کر حملہ کرنے والا ہوں، بتاؤ اے دوستو! اور بہادرو! تم میں سے کون میرا ساتھ دے گا اور کون وطن مقدس کو آزاد کرانے کے لیے اپنا خون بہائے گا؟ کون اس موقعہ سے فائدہ اٹھائے گا جو قدرت نے ہمیں عطا فرمایا ہے؟"

سب سے پہلے تنویر کی آواز فضا میں بلند ہوئی، اس کے بعد کیمپ کے تمام قیدیوں نے عہد کیا کہ ہم ہندوستان پر حملہ کریں گے اور انگریزوں کو اپنے وطن

سے نکال کر دم لیں گے۔

نیتاجی کے پہلو میں وہ جاپانی کمانڈر بھی کھڑا تھا جس نے انگریزوں سے اور ہندوستانی سپاہیوں سے ہتھیار ڈلوائے تھے، جس سے تنویر کی جنگ ہوگئی تھی، اس نے تنویر کا یہ جذبہ دیکھا، بہت خوش ہوا، اس نے تنویر کو گلے سے لگالیا اور کہا۔

"تم بہادر ہو ہمیں یقین ہے کہ تم ضرور ہندوستان کو فتح کرلوگے؟"

پھر اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں نیتاجی سے اس کا تعارف کرایا، وہ بھی اس سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کہا،

کیپٹن تنویر، تم یقین رکھو، ہم ہندوستان کو انگریز کی غلامی سے آزاد کرالیں گے، تو دنیا کی کوئی طاقت ہم پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گی، ہندوستان آزاد ہوتے ہی دنیا کا بہت بڑا طاقتور ملک بن جائے گا، اور اگر کسی نے ہمیں ٹیڑھی آنکھ سے دیکھا، تو جو ہاتھ انگریز کی آنکھ پھوڑ سکتے ہیں، وہ دوسرے دشمن کا سر توڑنا بھی جانتے ہیں۔

تنویر نے اس سے پہلے کبھی بھی نیتاجی کو نہیں دیکھا تھا، آج اس کے سامنے وہ شخصیت کھڑی تھی جس نے غلام ہندوستان کو آزاد کرانے کا بیڑہ اٹھایا تھا، اس کی صورت کتنی دل کش تھی، اس کی باتیں دل موہ لینے والی تھیں، اس کی دلیلیں کتنی وزنی تھیں، اس کے خیالات کتنے بلند اور پاکیزہ تھے، اس کے ارادے کتنے مبارک اور مسعود تھے، اس کی نیت کتنی نیک اور خالص تھی۔

تنویر کے دل نے کہا، بے شک یہ شخص مستحق ہے کہ اس کے ہاتھ میں قسمت کی باگ دے دی جائے، یہ خود شاہ بننا نہیں چاہتا، ایک سپاہی کی طرح اپنے دیس کو آزاد کرنا چاہتا ہے، یہ اپنے لیے کچھ نہیں چاہتا، جو کچھ چاہتا ہے، اپنے ملک کے لیے، یہ ہندو ہے، لیکن مسلمانوں پر بھروسہ کرتا ہے، اُسے گرو نانک کا نام یاد ہے تو خواجہ اجمیری کا ذکر بھی اس کی زبان پر ہے، یہ مہاتما گاندھی کا مداح ہے تو مولانا محمد علی کا بھی عقیدت شناس ہے، صرف یہی شخص ہندوستان کا بیڑہ پار لگا سکتا ہے، بس یہی ہے، جو ہندوستان کو آزاد کرائے گا، اس کے جھنڈے تلے لڑنا، لڑتے لڑتے مر جانا سب سے بڑی سعادت ہے، سب سے بڑی خوش قسمتی ہے ——— "جے ہند!"

یہ نعرہ بلا ارادہ تنویر کے منہ سے یہی باتیں سوچتے سوچتے نکل گیا، نیتا جی نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا، شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا، اور کہا،

"ہندوستان کی جے چاہتے ہو، تو تمھیں آزاد ہند فوج کا سپاہی بننا پڑے گا!"

ایک عزم کے ساتھ تنویر نے کہا،

"میں تیار ہوں!"

انھوں نے محبت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا،

"شاباش!"

عجیب و غریب واقعہ

نیتاجی کی شخصیت بڑی سحر انگیز تھی، سنگاپور کے ہندوستانیوں سے جب انھوں نے اپیل کی، تو کروڑوں روپیہ آن کی آن میں جمع ہوگیا، آزاد ہند فوج قائم ہوگئی، آزاد ہند حکومت کی داغ بیل پڑ گئی، نیتاجی اس کے صدر تھے، اور ایک درجن کے قریب ان کے وزراء،

ہندوستان میں تنویر نے ملازمتوں اور عہدوں کے سلسلہ میں ہندو مسلم کشمکش دیکھی تھی، یہ دیکھا تھا کہ مسلمان، قابلیت اور استحقاق کے باوجود محروم کر دیے جاتے ہیں، لیکن نیتاجی کے دربار میں یہ بات نہ تھی، یہاں ہندو اور مسلمان ایک نظر سے دیکھے جاتے تھے، یہاں دونوں سے یکساں سلوک کیا جاتا تھا، بڑے بڑے عہدے اور وزارت کے منصب اگر ہندوؤں کو ملتے تھے، تو مسلمانوں کو بھی محروم نہیں رکھا جاتا، خود ذاتی طور پر نیتاجی کا یہ حال تھا کہ وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے، ان کے معتمدین میں مسلمان بہت زیادہ تھے اور ہندو بہت کم، یہ رنگ دیکھ کر تنویر کا دل نیتاجی کے عشق سے سرشار ہوگیا، وہ اپنے بزرگوں کی اتنی عزت نہیں کرتا تھا، جتنی

نیتاجی کی کرتا تھا، اپنا دین، ایمان ضمیر، خیال، رائے ہر چیز اس نے نیتاجی کے حوالہ کردی تھی، اتنا بھروسہ تھا، اسے، نیتاجی کی انسانیت اور شرافت پر،

ایک روز ایک نجی مجلس میں نیتاجی رونق افروز تھے، اپنے وزیروں —— عہدیداروں اور آزاد ہند فوج کے سپاہیوں سے ہنس ہنس کر بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے، وہ سرکاری کام اور اوقات کے علاوہ جب کبھی نجی مجلس میں بیٹھتے تھے، تو نہ وقار شاہی کا سوال پیدا ہوتا تھا، نہ دبدبۂ حکومت کا وہ اس سادگی، اور مساوات سے ہر ایک سے ملتے تھے، باتیں کرتے، ہنسی مذاق میں حصّہ لیتے کہ یہ معلوم ہی نہ ہوتا، یہ آزاد ہند جمہوریت کے صدر، آزاد ہند فوج کے سپہ سالار ہیں، یہ معلوم ہوتا ہمیں میں سے ایک آدمی ہے، ہم سب برابر ہیں، ہم میں اونچ نیچ، چھوٹے بڑے کا کوئی فرق اور سوال ہی نہیں ہے۔

باتوں باتوں میں کرنل ارشاد نے نیتاجی سے کہا،

"آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟"

نیتاجی نے تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ جواب دیا،

"میں چالیس کروڑ غلاموں میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کرنا چاہتا!"

یہ جواب کچھ ایسے تیور سے نیتاجی نے دیا کہ حاضرین پر دہشت چھا گئی، سناٹا سا طاری ہو گیا سارے مجمع پر، اور ٹھیک اسی وقت، دل ہی دل میں خدا کو گواہ کر کے تنویر نے عہد کیا کہ وہ بھی نزہت سے اس وقت تک

شادی نہیں کرے گا، جب تک ہندوستان آزاد نہیں ہو جائے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد یہ مجلس برخاست ہو گئی، تنویر یہاں سے اٹھ کر سیدھا اپنے کیمپ میں پہنچا، یہاں لفٹننٹ اخلاق اس کا انتظار کر رہے تھے، یہ دونوں آپس میں بڑے دوست تھے، ہم نوالہ و ہم پیالہ، اخلاق نے کہا۔

"بڑی دیر کی یار تم نے، کہاں رہ گئے تھے آج اب تک؟"

"کہیں نہیں ذرا نیتاجی کے خیمہ تک چلا گیا تھا!"

"نیتاجی نے تم پر جادو کر دیا ہے!"

"صرف مجھی پر، یا ہر ہندوستانی پر!"

"لیکن یہ طلسم جلد ٹوٹے گا!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جب ملمع اُتر جائے گا، قدر عافیت معلوم ہو جائے گی!"

"ملمع کیسا؟"

"جو تمھارے نیتاجی پر چڑھا ہوا ہے۔"

"یعنی؟"

"یہ شخص تم سب کو بیوقوف بنا رہا ہے اور تم بن رہے ہو!"

"بے وقوف؟"

"ہاں اور کیا!"

"وہ کیسے؟"

"جب ہندوستان پر حملہ ہوگا، اور وہ فتح ہو جائے گا، اور وہاں ہندو حکومت قائم ہو جائے گی، تب دیکھیں گے ہم آپ کے نیتاجی کو!"

"تم نیتاجی کے بارے میں ایسے ناپاک خیالات رکھتے ہو، اس کا مجھے وہم بھی نہ تھا!"

"میری آنکھیں تمھاری طرح بند نہیں ہیں، کھلی ہیں!"

"تم غدّار ہو!"

"غدّار تم ہو، تم دس کروڑ مسلمانوں کو، ہندوؤں کا غلام بنا دینا چاہتے ہو!"

"تم بے وقوف بھی ہو، نیتاجی نہ ہندو ہیں نہ مسلمان، صرف ہندوستانی ہیں، ان کی نظر میں ہندو اور مسلمان برابر ہیں!"

"کب سے؟"

"ہمیشہ سے!"

"بالکل غلط! یہ نیتاجی وہ بزرگ ہیں، جو اوّل درجہ کے مہاسبھائی ذہنیت رکھتے ہیں، انھوں نے، سی آر داس جیسے غیر متعصب اور رواداری لیڈر کو نیچا دکھایا، انھوں نے اپنی صدارت کانگریس کے زمانہ میں، مسلمانوں کو زک پہنچائی ——"

اخلاق کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ تنویر نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا،

"چُپ رہو، تم اوّل درجہ کے متعصب اور فرقہ پرست ہو، دیکھتے نہیں آزاد ہند فوج کے بڑے بڑے عہدوں پر کتنے مسلمان فائز ہیں!"

"ہاں کیوں نہیں، قربانی کا بکرا بننے کے لیے!"

"لیکن خود نیتاجی بھی، تو میدان جنگ میں سب سے آگے آگے رہتے ہیں!"

"بے شک! لیکن ہندوستان کو فتح کرنے اور مسلمانوں کو غلام بنانے کے لیے!"

"پھر تم آزاد ہند فوج میں کیوں شریک ہو؟"

"اسی طرح جیسے تم انگریزی فوج میں شریک تھے!"

"لیکن میری آنکھیں تو کھل گئیں، میں تو اب انگریزوں سے لڑ رہا ہوں!"

"میری آنکھیں بھی کھل چکی ہیں، جب وقت آئے گا، میں بھی تمھارے نیتاجی سے سمجھ لوں گا!"

"اتنے خطرناک ارادے ہیں تمھارے؟"

"وہ سپاہی سپاہی نہیں، جو خطرناک ارادے نہ رکھتا ہو!"

تنویر کے چہرہ پر سنجیدگی طاری تھی، دفعتہً اس نے سیٹی بجائی، چند مسلّح سپاہی خیمہ کے اندر آموجود ہوئے، تنویر نے ان سے کہا،

"میں تمھیں حکم دیتا ہوں، انھیں گرفتار کرلو!"

سپاہیوں کو اس حکم پر حیرت ہوئی، وہ تصویر حیرت بن کر کھڑے ہو گئے خود اخلاق بھی ہکا بکا تنویر کو تک رہا تھا، تنویر نے ڈانٹ کر سپاہیوں سے کہا،

"میرا منہ کیا دیکھتے ہو، اپنا کام کرو۔"

سپاہیوں نے بڑھ کر اخلاق کو حراست میں لے لیا، تنویر نے کہا،

"باعزّت گرفتاری نہیں، سبق آموز گرفتاری!"

سپاہی پھر تنویر کا منہ دیکھنے لگے، اس نے بپھرے ہوئے لہجہ میں شیر کی طرح گرج کر کہا۔

"یہ غدّار ہے، اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال دو۔"

اس حکم کی بھی فوراً تعمیل ہوئی، تنویر نے اخلاق سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تم میرے عزیز ترین دوست تھے، لیکن آج سے میں تمھارا دشمن ہوں ——— بڑی سے بڑی دوستی، ملک پر، نیتاجی پر، قربان کی جا سکتی ہے، میرا دل، تمھاری یہ حالت دیکھ کر کڑھ رہا ہے، لیکن اگر ضرورت ہوئی، تو بے تامّل اپنی تلوار سے میں تمھاری گردن اڑا دوں گا، فیصلہ کا انتظار کرو، دیکھو کیا ہوتا ہے!"

اخلاق مسکرایا، اس نے کہا،

"جو کچھ کرنا ہے ابھی کر ڈالو، بڑی خوشی ہوگی، اگر میری گردن تمھاری تلوار سے قلم ہو!"

"ممکن ہے یہ تمنا جلد پوری ہو جائے!"

"جو آج مرنا چاہتا ہے، اُسے کل کے وعدے پر کیوں ٹالتے ہو؟"

"وطن کے غداروں سے میں زیادہ گفتگو کرنا نہیں چاہتا، تم غدّار ہو، ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن!"

"ہر بات کا فیصلہ اس قدر جلد نہ کر دیا کرو، ممکن ہے مستقبل کے مؤرخ

کی رائے کچھ اور ہو، وہ تمھیں غدار قرار دے اور مجھے ملّت اور قوم کا پرستار!"

"میں اُس مورخ کی گردن بھی اپنی تلوار سے اُڑا دوں گا، جو وطن کے جانباز سپاہیوں کو غدار لکھنے کی جرأت کرے گا!"

پھر تنویر نے سپاہیوں سے کڑکتی ہوئی آواز میں کہا،

"لے جاؤ قیدی کو یہاں سے!"

حکم کی تعمیل ہوئی اور اخلاق پابجولاں اپنے دوست کے خیمہ سے خطرناک اور باغی قیدیوں کے کیمپ میں پہنچا دیا گیا

تنویر ایک جنون کے عالم میں ٹہل رہا تھا، کبھی زور زور سے چلنے لگتا تھا کبھی آہستہ آہستہ، کبھی زیرلب کچھ بڑبڑاتا، کبھی خاموش ہو جاتا، چلتے چلتے وہ دفعتہً رُکا، اخلاق کی تصویر سامنے، ایک فریم میں آویزاں میز پر رکھی تھی اور مسکرا رہی تھی، تنویر نے تصویر کی طرف دیکھا اور کڑے تیوروں کے ساتھ کہا۔

"میرا سگا بھائی بھی اگر تمھاری جگہ ہوتا، تو اس کے ساتھ بھی میں یہی سلوک کرتا!"

آدھی سے زیادہ رات گزر جانے کے بعد تک، تنویر اپنے خیالات میں کھویا کھویا سا، ڈبڈبا سا ٹہلتا رہا، پھر وہ خاموشی کے ساتھ چارپائی پر آ کر لیٹ گیا، تصوّر کی نظر اب اخلاق سے ہٹ کر نزہت کے دل رُبا، اور پیارے مکھڑے پر جمی ہوئی تھی اور وہ دل ہی دل میں اس سے کہہ رہا تھا

"جدائی کی یہ گھڑیاں جتنی تمھارے لیے کٹھن ہیں، اس سے زیادہ میرے لیے، کچھ دن اور انتظار کرو، وہ وقت جلد آنے والا ہے، جب غلام ہندوستان آزاد ہوگا، اور آزاد ہندوستان میں ہم دونوں زندگی بھر کا پیمانِ وفا باندھیں گے، غلاموں کے عہد بودے ہیں، مرد آزاد کا پیمان پختہ ہوتا ہے ——"

وہ سو گیا!

صبح اُٹھ کر اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اخلاق کے باغیانہ اور غدارانہ خیالات سے ایک طرف تو نیتاجی کو مطلع کیا، دوسری طرف فوراً کورٹ مارشل کا انتظام کیا۔

فوجی عدالت کے سامنے اخلاق ایک مُجرم کی حیثیت سے پیش کیا گیا آج بھی اس کے چہرے پر وہی سکون و اطمینان موجود تھا جس کا جلوہ کل نظر آیا تھا، تنویر کے تیوروں میں بھی فرق نہیں تھا، اس نے پورے سکون و اطمینان کے ساتھ عدالت کے سامنے شہادت دی، اور کٹہرہ سے نیچے اُتر آیا۔

کچھ اور شہادتیں بھی ہوئیں، تیسرے روز عدالت نے، اخلاق کو غدّاری اور بغاوت کے جُرم میں گولی سے اڑا دینے کی سزا دے دی، سزا کا حکم سُن کر تنویر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، لیکن اخلاق کے تبسّم میں کوئی فرق نہ آیا، اس نے کہا،

"یہ آنسو اگر ندامت کے ہیں تو معاف کرتا ہوں، اگر ہمدردی کے ہیں تو حقارت کے ساتھ انھیں ٹھکراتا ہوں!"

بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کی جھنجھناہٹ ساکن فضا میں بلند ہوئی، اور اخلاق مسلح سپاہیوں کے جلو میں قید خانہ کی طرف روانہ ہو گیا، جب وہ تنویر کے قریب پہنچا، تو تنویر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا،

"میرے فرض کا تقاضا یہی تھا!"

"کاش تم فرض کے معنی سمجھتے ـــــ تم مجھ سے ہمدردی نہ کر سکے، لیکن مجھے تم سے ہمدردی ہے!"

سپاہیوں نے اخلاق کو اتنا موقع نہ دیا کہ وہ تنویر کا جواب سن سکتا، وہ خراماں خراماں، مسلح دستے کی حفاظت میں، اس منزل کی طرف روانہ ہو گیا، جہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا،

تنویر اپنے خیمے میں آیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اسے اخلاق سے محبت تھی، لیکن ملک سے، اور نیتا جی سے زیادہ نہیں، وہ ملک اور نیتا جی کی خاطر، اخلاق کی جان اپنے ہاتھوں سے لے سکتا تھا، لیکن اپنے گمراہ دوست سے جو محبت تھی، اس کا اظہار اگر آنکھیں کرنے لگیں، تو وہ منع بھی نہیں کر سکتا تھا!

امفال کا مورچہ

جس طرح فرانس، ہالینڈ اور یونان کی حکومتیں لندن میں بیٹھی "دشمن" کو بددعائیں دے رہی تھیں، اسی طرح ہندوستان کی حکومت، سنگاپور میں بیٹھی "دشمن" کو زک دینے کے وسائل پر غور کر رہی تھی۔

آزاد حکومت اور آزاد ہند فوج کے ہر فرد کے دل میں، بس ایک ہی جذبہ کارفرما تھا، جلد از جلد ہندوستان پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا جائے یہ سورما اور سادنت میدان جنگ میں اُترنے کے لیے بے چین تھے، چاہتے تھے، سپہ سالار اعظم (نیتاجی) کا اشارہ ہو، اور کفن سر سے لپیٹ کر، وطن کے غاصب اور جابر فرمانرواؤں پر ٹوٹ پڑیں، تنویر کا اضطراب خاص طور پر قابل دید تھا، وہ اکثر نیتاجی سے تقاضا کیا کرتا کہ آخر وہ مبارک دن کب آئے گا جب ہمیں ہندوستان پر چڑھائی کی اجازت ملے گی، نیتاجی مسکرا کر جواب دیتے، ہم ہندوستان پر حملہ ضرور کریں گے، لیکن جنگ کے نقشہ پر اچھی طرح غور کر کے، تم مایوس نہ ہو، وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے۔

اور آخر کار وہ مبارک وقت آگیا، نیتاجی کے حکم سے آزاد ہند فوج کے

سپاہی، تنویر کی کمان میں، دشوار گذار راستے طے کرتے ہوئے، کڑی منزلیں سر کرتے ہوئے، فاقے کرتے ہوئے اور پیاس کے عالم میں ہونٹوں کو چباتے ہوئے، دشمن کی نظر سے بچتے، اور اسے دھوکہ دیتے ہوئے، ریاست منی پور کی راجدھانی امفال پر پہنچ گئے۔

انگریزوں نے، پروپیگنڈہ کیا تھا کہ مشرق میں ان کے دفاعی استحکامات فرانس کی میجنو لائن، اور جرمنی کی سیگفریڈ لائن سے کم مضبوط اور مستحکم نہیں ہیں، ہندوستان کے اخبار نویسوں کو طیاروں پر بٹھا کے، ان استحکامات کی سیر کرائی، اور باور کرادیا کہ اگر جاپان نے ادھر کا رخ کیا، تو منہ کی کھائے گی، لیکن مشرق کے جن دو مورچوں پر انگریزوں کو سب سے زیادہ ناز تھا وہی روئی کے گالے کی طرح دھنک کر رکھ دیے گئے، جنگِ جاپان کے شروع میں سنگاپور کا وہ بحری اڈہ، جو وسعت، پائداری اور استحکام کے لحاظ سے ساری دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا، آن کی آن میں، بتاشے کی طرح ٹوٹ گیا، یہاں برطانیہ کے قابلِ فخر اور مایۂ ناز بحری جہاز موجود تھے، دفعتہً وہ سمندر کی لہروں پر رقصِ بسمل کا تماشہ دکھاتے ہوئے، اس طرح بیٹھے کہ تہ تک پہنچ کر دم لیا، برطانیہ کا سب سے بڑا جنگی جہاز "ریپلس" دیکھتے دیکھتے "عالمِ بالا" سے تحت الثریٰ میں پہنچ گیا، دوسرا مورچہ آسام کا تھا، یہاں کے دفاعات پر بھی انگریزوں کو ناز تھا اور ان کا خیال تھا کہ اس سدِ سکندری سے اگر دشمن ٹکرائے گا تو اپنا سر پھوڑنے کے سوا کچھ نہیں کر سکے گا، لیکن جاپانی ماہرینِ جنگ کی سربراہی اور اشتراکِ عمل سے بہادر فوج یلغار کرتی ہوئی آگے

بڑھی تو یہ سارے استحکامات چور چور ہو گئے، منی پور کی ہوشربا ناچنے والیاں اپنا ناچ بھول گئیں اور مہاراجہ منی پور کے پرانے دوست، انگریزوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، ایسا رن پڑا کہ انگریزی فوجیں اس یورش کو نہ روک سکیں اور آزاد ہند فوج کے دلاور، جے ہند کے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔

لیکن جنگ بہر حال جنگ ہے، اس میں کبھی ہار ہوتی ہے، کبھی جیت۔ بالآخر امریکہ کی پشت پناہی کام آئی اور انگریزی فوجیں، پیچھے ہٹتے ہٹتے آگے بڑھنے لگیں، اور آزاد ہند فوج کے جیالے سپاہی، آگے بڑھتے بڑھتے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔

یوں تو آزاد ہند فوج کا ہر سپاہی بڑی بے جگری اور بہادری سے لڑا لیکن تنویر کے جوش جہاد کا رنگ ہی کچھ اور تھا، وہ فوج کی کمان بھی کر رہا تھا اور لڑ بھی رہا تھا، اس مورچہ پر جاپانی خاطر خواہ مدد نہ کر سکے، نہ سامان جنگ کافی پہنچ سکا، نہ غذا، نہ دوائیں، نہ کپڑے، تنویر نے فوج کا حوصلہ قائم رکھا، میدان جنگ میں آخر وقت تک، بار بار زخمی ہونے کے باوجود ڈٹا رہا، لیکن وہ قدرت اور قسمت سے نہیں لڑ سکتا تھا، آخر اس کی فوجوں کو پیچھے ہٹنا پڑا، لیکن ذاتی طور پر وہ تہیہ کر چکا تھا کہ چند سرفروش ساتھیوں کے ساتھ آخر وقت تک جنگ میں جما رہے گا، اپنے اس عزم پر وہ اس وقت تک قائم رہا، جب تک دشمن کی گولی سے زخمی ہو کر میدان جنگ میں گر کر گرفتار نہ ہو گیا۔

گرفتاری کے بعد ایک عرصہ تک وہ انگریزوں کے فوجی ہسپتال میں زیر علاج رہا، گولی سینہ پر لگی تھی، اور چھروّں نے کئی پسلیاں توڑ دی تھیں، خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا اور زندگی کی آس بہت کم رہ گئی تھی، پھر بھی انسانی خون کا بار بار انجکشن دیا جا رہا تھا تاکہ تندرست ہو کر وہ پھانسی کے تختہ پر لٹکایا جا سکے۔

تنویر ابھی پورے طور پر صحت مند نہ ہوا تھا کہ اسے ہیروشیما اور ناگاساکا پر ایٹم بم کی تباہ کاریوں کا علم ہوا، پھر خبر ملی کہ جاپان نے ہتھیار ڈال دیے، پھر معلوم ہوا کہ جاپان کے نئے اور پرانے مقبوضات، امریکن اور انگلش افواج کے قبضہ میں بے لڑے بھڑے آنے لگے۔

یہ خبریں کم روح فرسا نہیں تھیں کہ چند روز بعد اس نے اخبار میں پڑھا نیتاجی ہوائی جہاز کے ایک حادثہ میں مجروح ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے، یہ ایسا غم تھا کہ وہ پھر بیمار پڑ گیا، اور اس بری طرح کہ جان کے لالے پڑ گئے، اس کا نام اس زرّیں فہرست میں تھا جو مقدمہ چلانے اور پھانسی کی سزا دلانے کے لیے انگریزوں نے مرتب کی تھی، لیکن وہ موت سے کشتی لڑ رہا تھا اور جب تک اس جنگ کا فیصلہ نہ ہو جاتا، اس پر بغاوت اور غدّاری کا مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا۔

لیکن بہت جلد ہندوستان کے حالات نے پلٹا کھایا، انگریزوں نے کانگرس سے صلح کر لی، اور آزاد ہند فوج کے ساتھ رحم، اور نرمی کا برتاؤ کرنے کا اعلان کر دیا، اگر تنویر تندرست ہوتا، تو اپنے بہت سے ساتھیوں کی طرح

فرنگیوں کی ہوس انتقام کا شکار بن کر اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہوتا، اس کے بہت سے ساتھی، ضبط و نظم کے نام پر موت کے گھاٹ اتر چکے تھے، وہ تو مجرم نمبر ایک تھا، سب سے پہلے اسی کے گلے میں پھندا پڑتا، لیکن خطرناک بیماری اور ہندوستان کے نئے حالات نے اسے پھانسی کے پھندے سے بچا لیا، اور اس طرح آزاد ہند فوج کے معتوب و مشہور سپاہیوں کا پہلا دستہ زنداں خانۂ فرنگ سے رہا ہوا۔ اس میں تنویر بھی تھا، رہائی میں جہاں اس کی بیماری اور ہندوستان کے جدید سیاسی حالات کا دخل تھا، وہاں جسٹس اکبر علی کی شخصیت بھی کام کر رہی تھی، انھوں نے اپنے اکلوتے اور محبوب لڑکے کی گلوخلاصی کے لیے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے تھے۔

رہا ہونے کے بعد، تنویر سیدھا لاہور پہنچا، باپ نے سینہ سے لگایا، ماں نے پیشانی چومی، بہن نے بادیدۂ پرنم سلام کیا، خیریت پوچھی اور رہائی کی خوشی میں صدقہ خیرات کی تیاریاں شروع کر دیں۔

تنویر اب اچھا ہو چکا تھا، لیکن کمزوری باقی تھی، جب تک وہ ہندوستان سے باہر تھا، جب وہ فوجی ہسپتال میں تھا، مجبور تھا، اب وہ رہا ہو چکا تھا، اور اس کا جی چاہتا تھا کہ اڑ کر پٹنہ جائے، اور نزہت کے حضور میں اپنا دھڑکتا ہوا دل پیش کر دے۔ وہ جان و دل سے نزہت کو چاہتا تھا، خلوت ہو کہ جلوت، بزم احباب ہو، یا نرغۂ اعداء ہر جگہ نزہت کی دل ربا تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے پھرا کرتی تھی، وہ چاہتا تھا نزہت کو دیکھے، اس سے ملے، اس سے باتیں کرے، اسے دیکھتا رہے، اس سے باتیں کرتا رہے، ہجر و جدائی کے زمانہ

کی ساری روئداد، اسے سنا دے، اپنے عزم وارادہ کا ایک ایک گوشہ اس کے سامنے بے نقاب کر دے، جو آگ اس کے دل میں، نیتاجی کی شخصیت، اور سحر کاری نے سلگائی تھی وہ ان کی موت، آزاد ہند فوج کی شکست اور جاپان کی تباہی کے باوجود سرد نہیں پڑی تھی، وہ اب بھی اسی عزم پر قائم تھا کہ جب تک ہندوستان آزاد نہیں ہو جائے گا، شادی نہیں کرے گا، لیکن ہندوستان جسٹس اکبر علی کے پر فضا بنگلہ میں بیٹھ کر دعا کرنے سے آزاد نہیں ہو سکتا تھا، اس کے لیے جہاد کی، بغاوت کی، جنگ کی ضرورت تھی، وہ طے کر چکا تھا، بہت جلد ہتھیاروں کو پرے رکھ کر، عدم تشدد کی جنگ، ملک کی آزادی کے لیے شروع کرے گا، اس مرتبہ وہ چاہتا تھا، نرہرت بھی میدان کارزار میں اس کے ساتھ ہو، وہ بھی میدان جنگ میں کود پڑے، زخمی ہو، چوٹ کھائے، مر بھی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

ذکر اُس پری وش کا — !

صبح کی چائے پی کر، تنویر ایک کرسی پر نیم دراز تازہ اخبار پڑھ رہا تھا کہ اس کی لاڈلی بہن کوثر، جوشِ مسرت سے بے تاب اچھلتی کودتی آئی اور اخبار چھین کر پرے پھینک دیا، تنویر اس کا منہ دیکھنے لگا۔

"کیا ہے؟ یہ اخبار تم نے کیوں پھینک دیا؟"

"پھینک دیا!"

تنویر کوشش کرتا تھا کہ، کوثر پر اپنا رعب قائم رکھے، بڑا بھائی تھا نا، لیکن سرپھری چھوکری، ذرا جو اس کے رعب کو خاطر میں لاتی ہو، محبت بھی کرتا تھا، بے رُخی کی خفّت بھی نہیں کرتا تھا، اس مرتبہ بھی یہی ہوا، بڑے بھائی کی شانِ جلال اپنے اوپر طاری کر کے اس نے کہا۔

"اٹھاؤ اخبار دیر ہو رہی ہے!"

اسی لہجہ میں کوثر نے جواب دیا۔

"نہیں اٹھاتے، ہمیں بھی بہت جلدی ہے!"

اپنی بے بسی چھپانے کے لیے تنویر مسکرانے لگا، کوثر بدستور سامنے

کھڑی تھی، وہ بھی مسکرا رہی تھی۔

ذرا دیر کے بعد آسمانی رنگ کے ایک خوش نما کاغذ کی جھلک تنویر کو دکھائی، اور بولی،

"ادھر دیکھئے بھیا!"

"دیکھ رہا ہوں۔"

"کیا ہے یہ؟"

"میں کیا جانوں!"

"بتائیے نہیں تو میں جاتی ہوں۔"

"جاؤ بھئی جاؤ۔"

"اپنے ساتھ یہ خط بھی لیتی جاؤں گی۔"

"خط!"

"ہاں، اور کمرہ سے نکلتے ہی پھاڑ بھی دوں گی اسے۔"

"کس کا خط ہے؟"

"آپ کو کیا!"

"عجب بے وقوف ہو، صاف صاف بتاؤ نا کس کا ہے؟"

"پھر آپ بگڑے؟ الا قسم ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی ابھی، پھر دیکھوں گی کیسے آنکھوں سے لگاتے ہیں آپ اسے؟"

تنویر مسکرایا۔

"اوہ، میں سمجھ گیا، نزہت کا خط ہے ——— تمھیں مٹھائی کا بہت

شوق ہے نا؟"

"ہے تو!"

تنویر نے ملازم کو فوراً حکم دیا، نواز حلوائی کے ہاں سے سیر بھر اعلیٰ درجہ کی مٹھائی فوراً لے آئے، اس کے جانے کے بعد، کوثر نے کہا

"لیکن بھیا مجھے مٹھائی سے اتنا شوق نہیں ہے، جتنا اعلیٰ درجہ کی کتابوں سے ہے!"

"شاباش، بڑا اچھا شوق ہے، یہ لو سو روپے کا نوٹ، اپنی پسند کی کتابیں خرید لاؤ جاکر خود ہی!"

کوثر نے نوٹ لے لیا، شکریہ ادا کیا اور باہر جانے لگی، تنویر نے آواز دی۔

"کوثر!"

"جی!"

"سنو تو!"

وہ پاس آکر کھڑی ہوگئی، تنویر نے کہا،

"لاؤ، ذرا ایک نظر ہم بھی ڈال لیں، تمھارے اس خط پر!"

"لیکن یہ تو میرے نام ہے!"

"اس سے کیا ہوتا ہے!"

"اپنا پرائیویٹ خط تو میں نہیں دکھاتی!"

"پھر آگئیں شرارت پر!"

"کچھ بھی کہیئے، نہیں دکھاؤں گی یہ خط!"

"تو مٹھائی مفت میں کھاؤ گی؟ کتابیں گھاٹے میں خریدو گی!"

"بھائی بہن کی خاطر کیا ہی کرتے ہیں، اس کا آپ طعنہ کیوں دے رہے ہیں —— ٹھیریئے میں ابھی جاکر امّی سے کہتی ہوں!"

کوثر پھر چلی، تنویر نے گھبرا کر پکارا،

"کوثر!"

"جی!"

"سنو تو!"

وہ سامنے آکر کھڑی ہو گئی، تنویر نے کہا،

"کیا لکھا ہے نزہت نے؟"

"کچھ عابدہ کا ذکر ہے، کچھ ریحانہ کا، کچھ قدسیہ آپا کا —— اور مجھ آپ کو ان باتوں سے کیا!"

"قدسیہ آپا کا ذکر بھی ہے؟"

"ہاں حج کرنے جا رہی ہیں!"

"بڑی مبارک خبر ہے، لانا تو خط ذرا میں بھی دیکھوں ——"

"پھر وہی، خط تو آپ لاکھ بہانے کریں میں نہیں دینے کی!"

"امّی نے تمھیں لاڈ پیار میں بہت بگاڑ دیا ہے، نہ بڑوں کا ادب کرتی ہو، نہ کہنا مانتی ہو!"

"یہی امّی آپ کے بارے میں کہتی ہیں، کل ہی تو ابّا سے کہہ رہی تھیں،

تنویر نے کوثر کو لاڈ پیار میں بالکل بگاڑ دیا ہے!"

تنویر پھر ہنسنے لگا، اس نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا،

"اچھا، یہ بتاؤ تم چاہتی کیا ہو؟"

"قیمت!"

"قیمت کس چیز کی؟"

"اس خط کی، اسے بیچ دوں گی آپ کے ہاتھ، پھر یہ میرا نہیں آپ کا ہو جائے گا، چاہے کتنی مرتبہ پڑھیے اور آنکھوں سے لگائیے!"

تنویر نے پھر ڈانٹا،

"یہ بار بار آنکھ سے لگانے کا کیا قصہ چھیڑا تم نے!"

"جو آنکھ سے دیکھا ہے، وہی زبان سے کہہ رہی ہوں ——— سودا کرنا ہے تو کیجئے، ورنہ یہ بات بھی ابھی کہتی ہوں جا کر امّی سے!"

تنویر نے عاجز آ کر کہا،

"اچھا بھئی منظور ہے، خرید لیں گے تمہارے اس خط کو، بتاؤ کیا قیمت دی جائے اس کی؟"

"بھیّا!"

"ہاں!"

"قیمت نہیں ہدیہ کہئے!"

تنویر نے ایک قہقہہ لگایا، اور کوثر کو تھپکتے ہوئے کہا۔

"جب میں سنگاپور گیا تھا، تو بڑی نیک اور بھولی بھالی تھی، اتنے

دلوں میں اتنی شیطان کہاں سے بن گئی۔"

"میں کچھ نہیں جانتی، لائیے پانچ سو روپے دیجئے، مجھے!"

"ارے ارے، یہ بک کیا رہی ہے، پانچسو روپے لے گی تو اس ایک خط کے؟"

"جی — ایک پیسہ بھی کم نہیں!"

"تجھے تو کسی بنیئے کے گھر پیدا ہونا چاہیئے تھا، بنیائن کہیں کی!"

"بڑے ساہوکار، اتنی دیر سے جھگڑ رہے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ لاکے سامنے رکھ دیں روپے!"

"اچھا لاؤ خط، شام کو روپے لے لینا۔"

"خط بھی شام کو ملے گا!"

بڑی بحث مباحثہ کے بعد تنویر نے روپے کوثر کے ہاتھ پر رکھے، اس نے چپ چاپ خط حوالے کر دیا، خط لے کر وہ پھر آرام کرسی پر دراز ہو گیا، کوثر بدستور کھڑی تھی، تنویر نے کہا،

"اب کیوں کھڑی ہو؟"

"یونہی آپ خط پڑھیئے!"

"خط پڑھوں یا پھاڑ کر پھینک دوں تمھیں کیا، تمھارا کام ہو گیا اب جاؤ!"

اتنے میں ایک زنانی آواز فضا میں گونجی،

"اری کوثر، ذرا ادھر آتو!"

کوثر مسکراتی ہوئی چلی، چلتے چلتے اس نے کہا،
"امی بلاتی ہیں اس لیے جاتی ہوں!"
اب اطمینان سے تنویر نے دروازہ اندر سے بند کیا، ایک سگریٹ سلگایا اور آرام کرسی پر لیٹ کر خط پڑھنے لگا:۔

"پیاری کوثر

شکر ہے تم نے یاد کیا، میں تو یہ سمجھ کر مایوس ہو چلی تھی کہ بہن بھی بھائی کے نقش قدم پر چل رہی ہے،

میں نے تمھارا خط بار بار پڑھا، کوثر تم ایسی باتیں نہ لکھا کرو، جو میرے دل کے ساز پر مضراب کا کام دیں، تم میری ہمدم و ہمراز ہو، جانتی ہو تمھارے بھیا کی محبت کا جواب میں نے محبت سے دیا، یہ عورت کی پرانی کمزوری ہے، کہ وہ دھوکا نہیں دیتی، اپنی محبت کا بے جھجک اعتراف کر لیتی ہے، میری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر، تمھارے بھیا سنگاپور گئے، وہاں ان پر جو افتادیں پڑیں، ان کے تصور نے مجھے نیم جان کر دیا، تم مجھے دیکھو گی تو پہچان نہ سکو گی، وہی نزہت جو پھول کی طرح تر و تازہ تھی، اب سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے، جب سے ان کے آنے کی خبر سنی ہے، ہر روز اس انتظار میں گزرتا ہے کہ آج وہ تشریف لائیں گے، آج ان کی تشریف آوری کی خبر آئے گی، لیکن وہ آئے تو بقول تمھارے ان کے دل میں کسی اور کی یاد چھائی ہوئی ہے، کسی اور کے خیال میں ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرا کرتے ہیں، کسی اور کی تصویر ہر وقت ان کے سامنے رہتی ہے، میں

اسی قابل تھی کہ بھلا دی جاؤں، تم نے مجھ سے پوچھا ہے، بھیّا تو آپ کو بالکل بھول چکے ہیں، آپ کے دل میں ان کی یاد باقی ہے یا نہیں؟ اس کا جواب میں کیا دوں، تم بھی عورت ہو، تمھیں خود سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ عورت مردوں کی طرح محبت کا سوانگ نہیں رچاتی، وہ صرف ایک بار محبت کرتی ہے ہمیشہ کے لیے، میرے دل میں اب کسی کی یاد جگہ نہیں پا سکتی، میں تو کوشش کر رہی ہوں، اس دل سے تمھارے بھیّا کی یاد بھی نکل جائے، اور اگر نہ نکلے تو مجھے موت آ جائے، میں محبت کی دریوزہ گری کرنا نہیں چاہتی، جو مجھ سے محبت نہ کرتا ہو، اس کے عشق میں گھل کر مر سکتی ہوں، لیکن اس کے عشق کا اعتراف نہیں کر سکتی خودداری صرف مرد کا حصّہ ہے، اور تم دیکھو گی، مرتے وقت میری آنکھوں کے سامنے تمھارے بھیّا کی تصویر ہو گی، لیکن زبان کی مجال نہیں کہ ان کا نام لے سکے، وہ اگر مجھے بھول چکے اور میری محبت سے دستبردار ہو چکے تو میں کیوں رو رو کر، اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر انھیں اپنی یاد دلاؤں اور محبت کی بھیک طلب کروں، نہیں کوثر ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

تمھاری شکر گزار ہوں کہ تم نے اپنے بھیّا کا کچّا چٹھا لکھ کر مجھے حقیقت حال سے باخبر کر دیا، ورنہ جانے کب تک میں غلط فہمی میں مبتلا رہتی، تم نے بہت اچھا کیا، ان کا بدلا ہوا رنگ دیکھ کر میرا ذکر ان سے نہیں کیا، میں درخواست کرتی ہوں کہ آئندہ بھی اسی روش پر قائم رہنا، بلکہ اگر کبھی ذکر نکل آئے تو انھیں یقین دلا دینا کہ میں بھی ان سے محبت نہیں کرتی"۔

تمھاری نزہت

یہ خط تنویر نے دس بارہ بار پڑھا، جب بھی پڑھا، برہمی، خفگی اور غصّہ کا ایک طوفان اُمنڈ آیا، وہ کوثر کو بہت چاہتا تھا، لیکن اگر اس وقت وہ اس کے سامنے ہوتی تو گولی مار دیتا، جان لے لیتا اس کی، وہ کوثر کو شریر سمجھتا تھا، لیکن یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی شرارت اتنی خطرناک اور مہلک ہو سکتی ہے،

تنویر مجنونانہ عالم میں ٹہلنے لگا، بار بار کوثر کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آتی تھی، اور اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی اس چہیتی لیکن حد سے زیادہ شریر بہن کا گلا گھونٹ دے، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس زہر کا تریاق کیوں کر مہیّا کرے، کیوں کر نزہت کو یقین دلائے کہ کوثر بڑی شیطان ہے، اس نے جو کچھ لکھا ہے، بالکل جھوٹ ہے،

اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، تنویر نے، کنڈی کھولی، جسٹس اکبر علی سامنے کھڑے تھے، انھوں نے محبت بھرے لہجہ میں پوچھا،

"کیا کر رہے ہو بیٹا؟"

"کچھ نہیں ابّا جان، ذرا طبیعت کسلمند تھی، اس لیے لیٹ گیا تھا، دروازہ کوثر کے ڈر سے بند کر لیا تھا، وہ سوتے میں بھی پریشان کرتی رہتی ہے"

باپ نے بیٹے سے کہا،

"آج پٹنہ سے افتخار بھائی کا خط آیا ہے، وہ تمھیں دیکھنے کے لیے بے چین ہیں، نزہت کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی طبیعت خراب نہ ہوتی تو خود آتے، میری رائے ہے تم چند روز کے لیے پٹنہ ہو آؤ، میں نے سیٹ بک

کرادی ہے، آج ہی شام کی گاڑی سے۔"

تنویر کو دل کی مراد مل گئی، وہ خوشی کے طوفان کو روکتا ہوا بولا۔

"بہت خوب، آج ہی چلا جاؤں گا!"

اور فوراً ہی سفر کی تیاریوں میں منہمک ہو گیا، اب وہ خوش تھا، بہت خوش، اس نے خود بخود کوثر کو معاف کر دیا، اس کے ذہن و دماغ میں صرف ایک خیال بسا ہوا تھا، جلدی شام ہو اور وہ پٹنہ روانہ ہو جائے،

اسی اثنا میں کوثر آ گئی، اسے دیکھ کر تنویر نے غصہ سے منہ پھیر لیا، ابھی ابھی وہ اسے معاف کر چکا تھا، لیکن سامنے آئی تو دل کا زخم پھر ہرا ہو گیا، گیا ہوا غصہ پھر واپس آ گیا، کوثر اس کا یہ رنگ دیکھ کر سب کچھ سمجھ گئی، وہ مسکرائی اور سامنے آ کر کھڑی ہو گئی،

"بھیا سفر مبارک، بہ سلامت روی و باز آئی۔"

تنویر نے دانت پیستے ہوئے کہا،

"تمھاری شرارت ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئی ہے، واپس آؤں پھر سمجھوں گا تم سے۔"

کوثر مسکراتی ہوئی چلی گئی!

اللہ یہ وہی ہیں جن کو ترس گیا ہوں!

تنویر، اشتیاقِ دید اور حسرتِ گفتار کا طوفان لیے ہوئے پٹنہ پہنچا، اسٹیشن پر، افتخار چچا تو نہ تشریف لاسکے، لیکن خیر مقدم کے لیے ان کے دونوں صاحبزادے انتصار، اور احتشام موجود تھے، تنویر ان کی معیت میں "دل افروز" پہنچا، یہ افتخار چچا کی کوٹھی کا نام تھا۔

افتخار صاحب، جسٹس اکبر حسین کے ایک جدی عزیز، دونوں کے دادا آپس میں سگے بھائی تھے، ان کا آبائی وطن لکھنؤ تھا، تلاشِ معاش میں ایک بھائی نے لاہور کو اپنا مسکن بنالیا، دوسرے نے پٹنہ کو، دونوں پھولے پھلے، اور پردیس میں بہت کامیاب رہے، اب اکبر حسین کی ساری جائیداد اور مستقل اقامت لاہور میں تھی، اور افتخار کی پٹنہ میں، تین نسلوں کا فرق پڑ چکا تھا اس لیے عزیز داری اب صرف قرابت تک محدود رہ گئی تھی، فاصلہ اتنا تھا کہ سالہا سال گذر جاتے تھے، ملاقات کی نوبت نہیں آتی تھی، کئی سال کی بات ہے، افتخار کو اپنی آنکھوں کے علاج کے سلسلہ میں لاہور جانا پڑا، قیام مع متعلقین کے اکبر حسین کے ہاں ہوا، اس اثنا میں نزہت اور تنویر بھی ملے، باتیں

ہوئیں، آنکھیں لڑیں، دل مل گئے، اکبر کو نزہت اتنی پسند آئی کہ انھوں نے اسے اپنی بیٹی بنالیا، تھی بھی وہ ایسی ہی، حسن دیکھئے تو مدر میئر، کردار دیکھئے لاکھوں میں ایک، آزاد خیال تعلیم یافتہ، انگریزی داں، لیکن شرم وحیاء کی پتلی، نماز روزہ کی پابند، اپنی قوم پر نازاں، اپنے مذہب پر مغرور، سلیقہ دیکھئے تو ہر فن مولا، سینے پرونے، پکانے، رینڈھنے میں طاق، صورت اتنی پاکیزہ جیسے گلاب کا پھول، سیرت اتنی پاک جیسے حور کا دامن، اسی طرح تنویر افتخار کو بھاگیا، اعلیٰ تعلیم یافتہ، وجیہ اور خوش رو کڈیل جوان، فوج میں ابھی ابھی کمیشن حاصل کیا تھا اور اب کچھ عرصہ بعد، کلکتہ بھیجا جانے والا تھا، باادب اتنا کہ کبھی آنکھ چار کرکے بات نہ کی، بامحبت اتنا کہ آنکھوں کے علاج کے سلسلہ میں، ساری دوڑ دھوپ، رضا کارانہ طور پر، اصرار کرکے اس نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی، یہ ادائیں افتخار کو کچھ اتنی پسند آئیں کہ وہ اسے اولاد کی طرح چاہنے لگے، اس چاہت سے تنویر اور نزہت نے خوب فائدہ اٹھایا، بے تکلفی اور ربط ضبط کے پینگ بڑھنے لگے، جو رفتہ رفتہ محبت میں تبدیل ہو گئے اور آخر دونوں کے بزرگوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ شادی کر دی جائے، شاید اس فیصلہ کا اعلان بھی ہو جاتا، لیکن تنویر کو اسپیشل ڈیوٹی پر، فوراً کلکتہ کی بجائے سنگاپور بھیج دیا گیا، اور وہاں چار پانچ سال تک ایسی افتادوں سے دوچار ہونا پڑا کہ نہ وطن آسکا، نہ نزہت سے مل سکا، نہ بات چھڑ سکی۔

آج ایک عرصہ کے بعد وہ نزہت کے وطن میں پہنچا تھا، اس کے قدم

لڑکھڑا رہے تھے، دل دھڑک رہا تھا، دماغ گھوم رہا تھا، انتصار اور احتشام اس سے سنگاپور کے واقعات پوچھ رہے تھے، جاپان کے حالات دریافت کر رہے تھے، گرفتاری کے قصے چھیڑ رہے تھے، آزاد ہند فوج اور نیتا جی کی شخصیت پر، گفتگو کر رہے تھے، لیکن وہ ہاں ہوں کے سوا کچھ نہیں بول رہا تھا، اس کا دل، نزہت میں اٹکا ہوا تھا، وہ سوچ رہا تھا، نزہت، اب چودھویں کا چاند بن چکی ہوگی، اب اس کا حسن قیامت کی شکل اختیار کر چکا ہوگا، پہلے وہ ایک نا شگفتہ کلی تھی، اب پھول بن چکی ہوگی، میں اسے دیکھوں گا تو میرے دل کی کیا حالت ہوگی؟ زبان کیوں کر اس کے سامنے کھلے گی؟ باتیں کیوں کر کروں گا؟ اور اس شیطان کی خالہ، کوثر نے اپنی شرارت سے جو غلط فہمیاں اور بدگمانیاں نزہت کے معصوم اور محبت بھرے دل میں پیدا کر دی ہیں، انھیں کیوں کر دور کر سکوں گا؟ یہی سوچ رہا تھا کہ کار، دل افروز کے احاطہ میں داخل ہوئی، افتخار چچا برآمدہ میں ٹہل رہے تھے، انھوں نے لپک کر تنویر سے معانقہ کیا، اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور گلے لگا کر خیریت دریافت کرتے ہوئے زنان خانہ میں پہنچ گئے، وہاں نزہت کی ماں نے چٹاچٹ بلائیں لیں، دامن پھیلا پھیلا کر دعائیں دیں، آنکھوں سے محبت کے آنسوؤں کا جھرنا بہایا اور لاہور و سنگاپور کے قصے لے کر بیٹھ گئیں۔

تنویر ان رسمیات میں الجھا ہوا تھا، لیکن اس کی آنکھیں نزہت کو ڈھونڈھ رہی تھیں، سب تھے مگر اس کا کہیں پتہ نہیں تھا، کیا وہ پردہ کرنے لگی ہے؟ لیکن کیا مجھ سے بھی؟ کیا خدا نخواستہ اس کی حالت زیادہ

خراب ہے ؟ لیکن ایسا ہوتا تو احتشام و انتصار، بلکہ خود چچا افتخار ذکر نہ کرتے ؟
کچھ دیر تک انتظار کرنے کے بعد، آخر وہ پوچھ ہی بیٹھا،

"چچی، نزہت کی طبیعت کیسی ہے ؟"

وہ بولیں،

"اب سے دو ر بخار آنے لگا تھا، میں تو بولا گئی تھی، اس پریشانی میں،
خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، بخار ٹوٹ گیا۔"

"ہیں کہاں وہ اس وقت ؟"

"ہوتی کہاں اپنے کمرہ میں ہو گی! ——— ابھی کمزوری باقی ہے، جاؤ
وہیں مل لو اس سے، تم سے پردہ کیسا اور حجاب کا ہے کا، جو، وہ، وہ تم،
جو تم، وہ، وہ! میرے لیے دونوں برابر ہیں ———"

تنویر، تیر کی طرح، سیدھا، نزہت کے کمرہ میں پہنچا، وہ اپنی مسہری
پر لیٹی ہوئی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی، تنویر کو آتا دیکھ کر بیٹھ گئی، سامنے
کرسی پڑی تھی، وہ اس پر بیٹھ گیا،

"کیسی ہو نزہت ؟"

"اچھی ہوں!"

"میرا مطلب ہے طبیعت کیسی ہے ؟"

"جی رہی ہوں!"

"بخار کیوں آ گیا تھا تمہیں ؟" یہ کہہ کر مسکرا دیا۔

"اب آئے گا تو پوچھ لوں گی!"

تنویر جھینپ گیا، اس نے بات کا پہلو بدل کر ہمدردی اور دل سوزی کے لہجہ میں کہا،

"تمھارے چہرے پر نقاہت اب بھی ہے!"

"نقاہت کیوں ہوتی اب تو بالکل اچھی ہوں۔"

"کچھ خفا ہو مجھ سے؟"

"خفا؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"سچ سچ بتاؤ!"

"کوئی بات بھی ہو بتاؤں کیا؟"

"کیا یہ سمجھتی ہو کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا؟"

"یہ میں نے کب کہا!"

"تمھیں کچھ شک ہے مجھ پر؟"

نزہت نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا،

"شک نہیں یقین!"

یہ کہہ کر، اس نے، ایک نظر تنویر کے افسردہ چہرے پر ڈالی، اور جھجکا لی، پھر بولی،

"لیکن مجھے کوئی شکایت نہیں ہے آپ سے!"

تنویر کی آنکھوں میں آنسو آچکے تھے، اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا،

"نزہت!"

نزہت نے نظر اٹھا کر دیکھا، بے تاب ہو کر بولی،

"ارے یہ کیا؟"

تنویر نے جلدی سے آنسو پونچھے اور کہا،

"کچھ نہیں!"

وہ باہر جانے کے لیے اٹھا، نزہت نے ٹوکا،

"کیا آپ جا رہے ہیں؟"

"ہاں!"

"کیوں؟ آپ تو میرے پاس آئے تھے!"

"افتخار چچا انتظار میں ہوں گے۔"

"ہونے دیجئے، بیٹھئے۔"

تنویر پھر بیٹھ گیا، نزہت نے پوچھا،

"آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں آ گئے تھے؟"

"اپنی بے بسی پر!"

"بے بسی تو عورت کا پیدائشی حق ہے، مردوں کو اس میں حصہ لگانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"غلط کہتی ہو نزہت، بے بسی صرف مظلوم کا حق ہے اور مظلوم مرد بھی ہو سکتا ہے، عورت بھی۔"

وہ مسکرائی، تنویر کا جی چاہا ان مسکراتی ہوئی آنکھوں کو اپنے دل میں رکھ لے، ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگا، وہ بولی،

"تو آپ مظلوم ہیں؟"

"مظلوم نہ ہوتا تو تمھاری بدگمانی کا نشانہ کیوں بنتا؟"

"بدگمانی کیسی؟"

"نزہت صاف صاف باتیں کرو، مجھے بتاؤ تم مجھ سے خفا ہو یا نہیں؟"

"مجھے خفا ہونے کا کیا حق ہے؟"

"اچھا میری محبت پر بھروسا کرتی ہو یا نہیں؟"

"یہ سوال آپ میرے بارے میں کرتے، تو میں کچھ جواب بھی دیتی، آپ کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں؟"

"تو مجھ سے پوچھو میں جواب دوں گا۔"

"آخر اس سوال و جواب کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

تنویر نے بے تاب ہو کر کہا،

"کتنی تلخی ہے تمھاری باتوں میں، تلخی نہیں نفرت ——— میں پوچھتا ہوں نزہت کیا وہ باتیں تم بھول گئیں، جو ہم میں ہوا کرتی تھیں، وہ محبت کی باتیں، وہ ترنم، وہ محبت کے نغمے، وہ اُلفت کے، وہ وفاداری کے وعدے، وہ ایک دوسرے کو یاد رکھنے کے پیمان؟"

نزہت نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا،

"کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو خود بخود بھول جاتی ہیں، کچھ ایسی ہوتی ہیں جنھیں بھلا دینا پڑتا ہے۔"

"آخر کیوں؟ کس لیے؟ کیا اس لیے کہ میں کسی اور سے محبت کرتے

لگا ہوں ؟ کسی اور کی یاد میں ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگا ہوں، کسی اور کو پُوجنے لگا ہوں ؟"

"سُنا تو ایسا ہی ہے !"

"کس سے ؟"

"ہوگا کوئی گھر کا بھیدی !"

اس اثنا میں خادمہ ایک لفافہ لے کر آئی اور ادب سے نزہت کے سامنے رکھ کر چلی گئی، نزہت نے اُسے کھولا، پڑھا، پھر مسکرائی، اور ایسی نظروں سے جن میں محبت کا نور جھلک رہا تھا، تنویر کو دیکھ کر کہا،

"کچھ غلط کہہ رہی ہوں میں ؟"

تنویر جھینپا، جس طرح سچّا آدمی جھوٹے کے سامنے گرجتا ہے،

"بالکل غلط !"

نزہت پھر مسکرائی،

"توبہ اللہ، آپ تو لڑنے لگے ! ـــــ اچھا معاف کر دیجیے۔"

وہ حیرت سے نزہت کا منہ دیکھنے لگا،

"کسے معاف کر دوں ؟"

"کوثر کو !"

"میں بالکل نہیں سمجھا، تمھارا مطلب !"

نزہت نے وہی لفافہ تنویر کی طرف بڑھا دیا، تنویر پڑھنے لگا،

پیاری نزہت آپا !

"خدا کی قسم میں نے تنویر بھیّا کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، بالکل جھوٹ تھا، صرف تمھارا امتحان لینے، اور بھیّا کی پریشانی کا لطف دیکھنے کے لیے لیکن وہ بات کا بتنگڑ بنتا نظر آرہا ہے۔ میں نے تمھارا خط امتحان لینے کے لیے انھیں دکھا دیا، بہت بگڑے، اسی دن پٹنہ کے لیے چل پڑے، اور چلتے چلتے دھمکی دے گئے کہ آکر تجھ سے سمجھوں گا، نزہت آپا وہ تمھیں بہت چاہتے ہیں، اگر تم نے میرے خط کی روشنی میں ان سے باتیں کیں، تو یقین جانو یہاں آتے ہی میرا صفایا کر دیں گے، وہ ٹھہرے فوجی آدمی، ان کے پاس نہ بندوق کی کمی ہے، نہ پستول کی، میں بیچاری کہاں چھپتی پھروں گی، ان کی وہ غصّہ سے بھری ہوئی لال لال آنکھیں اب تک مجھے یاد آرہی ہیں! اچھی میری آپا، بھیّا کو خفا مت کر دینا، ورنہ مجھ معصوم، اور بے گناہ کا خونِ ناحق تمھاری گردن پر ہوگا

——————"

تنویر نے خط نزہت کی طرف بڑھا دیا، اور کہا،

"بڑی شیطان ہوگئی ہے، یہ کوثر بھی"۔

"اچھا اب اسے کچھ نہ کہئے گا!"

"بہت خوب، لیکن ایک شرط ہے!"

"کہئے!"

"اپنے سارے الفاظ واپس لیجئے، اور ——!"

"الفاظ ابھی واپس لیے لیتی ہوں،" "اور" پھر دیکھا جائے گا!"

اتنے میں خادمہ آئی، اس نے تنویر سے کہا،
"بڑے صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں!"
تنویر اٹھ کر چلا گیا!

چاندنی رات

چاندنی نکھلی ہوئی تھی، کبھی کبھی بادل کا ایک آدھ ٹکڑا فضا میں گھومتا گھامتا چاند کی طرف بھی آنکلتا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے بادل کے پردے سے چاند آنکھ مچولی کھیل رہا ہے، جب ابر کا ٹکڑا گزر جاتا، چاند پھر اپنی بہار دکھانے لگتا تھا،

نزہت کے غسل صحت کی خوشی میں، آج اس کی کئی سہیلیاں آئی تھیں، عابدہ، ریحانہ، رضیہ، طلعت، سب نزہت کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھیں، اور اسے جان و دل سے چاہتی تھیں، پائیں باغ میں، اس وقت محفل جمی ہوئی تھی، کچھ دیر تک تو ہنسی دل لگی کی باتیں ہوتی رہیں، پھر نغمہ و موسیقی کا دور شروع ہو گیا، نزہت ان سب میں اچھا گاتی تھی، وہ گا رہی تھی، اور اس کی سہیلیاں مست و بے خود اس کے گانے پر سر دھن رہی تھیں، عین نغمہ سرائی کے عالم میں تنویر ادھر سے گذرا، اس نے جو نزہت کو گاتے سنا تو آڑ میں ہو کر اطمینان سے گانا سننے لگا، تھوڑی دیر کے بعد عابدہ اٹھی اور ادھر سے گذری، جہاں تنویر محویت کے عالم میں نزہت کا گانا

سُن رہا تھا، عابدہ نے تنویر کو دیکھ لیا، لیکن وہ نہ دیکھ سکا، اس کی محویت کا یہ رنگ دیکھ کر عابدہ مسکرائی، اور دفعتہً "چور" "چور" کا شور مچانے لگی، تنویر ہکا بکا کھڑا کا کھڑا رہ گیا، پاس ہی پوری پارٹی بیٹھی تھی، سب اُٹھ کر اُدھر آگئیں، تنویر اب تک گم صم کھڑا تھا، نزہت نے عابدہ سے کہا،

"پگلی کہیں کی، کہاں ہے چور؟"

عابدہ نے سہمے ہوئے انداز میں تنویر کی طرف دیکھا اور کہا،

"یہ! ——— یہ چوری سے تمھارا گانا سُن رہے تھے!"

سب ہنسنے لگیں، نزہت بھی مسکرادی، اس نے کہا،

"چل ہٹ، تجھے تو ہر وقت دیوانہ پن سوجھتا ہے!"

پھر وہ تنویر سے مخاطب ہوئی،

"آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں، آئیے!"

سب آکر پھر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے، اس مجمع میں تنویر اجنبی نہیں تھا، نزہت کی ہمراز سہیلیاں بہت پہلے سے اُسے جان گئی تھیں، اور عابدہ تو نزہت کی سہیلی بھی تھی اور انتصار کی سالی بھی، وہ تو اچھی طرح تنویر سے واقف تھی۔

کچھ دیر تک سب لوگ یونہی چپ چاپ بیٹھے رہے، تنویر نے قفلِ خاموشی توڑا،

"میرے آنے سے تو اس چمنستان میں سناٹا چھا گیا، بہتر یہی ہے کہ

اجازت چاہوں!" °

عابدہ بولی،

"کچھ آپ ہی چھیڑیئے! ـــــ فوجی گانا سننے کو جی بہت چاہتا ہے ہمارا!"

طلعت نے مسکراتے ہوئے کہا،:

"لیکن فوجی باجہ بھی چاہیئے، وہ کہاں سے آئے گا؟"

عابدہ نے جواب دیا،

"پستول اور بندوق تو گھر میں ہے، مشین گن، اور توپ ابھی چھاؤنی میں ٹیلیفون کر کے منگالیں گے۔"

نزہت کیوں چپ رہتی، اس نے کہا،

"اب فوج کا باجہ، پستول اور بندوق، توپ اور مشین گن نہیں رہا۔"

ریحانہ نے سوال کیا،

"پھر کیا ہے اب؟"

نزہت نے جواب دیا،

"چرخہ! ـــــ تم جانتی نہیں ہو ہمارا صوبہ کانگرسی صوبہ ہے، یہاں سب عدم تشدد کے اوتار بستے ہیں، یہاں توپ کی بجائے چرخہ چلتا ہے!"

تنویر سے بھی خاموش نہ رہا گیا؛

"آزاد ہندوستان کا قومی نشان چرخہ ہی ہوگا!"

نزہت بولی،

"ضرور ہوگا، لیکن صرف ہندوستان کا پاکستان کا نہیں!"

تنویر نے کہا،

"ٹھیک کہتی ہو، پاکستان کا قومی نشان ہوگا "جان بل" — انگریز!"

نزہت کا چہرہ تمتما گیا، اس نے قدرے سختی اور درشتی کے لہجہ میں کہا،

"آپ مسلمان ہوکر، مسلمانوں کے قومی نصب العین کی توہین کرتے ہیں، آپ کو شرم نہیں آتی!

"اس میں شرم کی کیا بات ہے؟ پاکستان کا فتنہ انگریزوں ہی کا پیدا کیا ہوا ہے!"

"یہ آپ نے کیسے جانا؟"

"میں کیا ساری دنیا جانتی ہے!"

"میں پوچھتی ہوں، پاکستان کے تصوّر کو آپ فتنہ کس بنا پر کہہ رہے ہیں؟"

"ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، ہندو مسلمان دو قومیں بن جائیں گے، صدیوں کا اتحاد خاک میں مل جائے گا، خون خرابہ ہوگا، یہ فتنہ نہیں ہے تو کیا ہے؟"

"سبحان اللہ کیا دلیلیں دی ہیں آپ نے بھی!"

عابدہ بولی،

"قربان ہو جانے پر جی چاہتا ہے ہمارا تو ان دلیلوں پر!"

ریحانہ کے والد، بڑے پرانے مشہور کانگرسی تھے، طنز و تعریض کی باتیں اُسے اچھی نہ لگیں، اس نے کہا،

"بہن ہنسی مذاق کی سند نہیں، دلیل کا جواب ہو سکے تو دلیل سے دو، ورنہ منہ چڑانے سے کیا حاصل؟"

نزہت بولی،

"لیکن کوئی دلیل ہو بھی، یہ تو ساری جذباتی باتیں ہیں، دلیل کا کہیں دُور و نزدیک پتہ نہیں!"

ریحانہ بولی،

"وہ کیسے؟"

نزہت :-

"یوں کہ ـــــ فرمایا گیا ہے، مُلک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، میں کہتی ہوں ہو جانے دو، خاندان مشترکہ کا تصوّر ہندو مت کا تصوّر ہے، اسلام کا نہیں، جو ہمارا حق ہے وہ ہم کیوں نہ لیں، صرف اس ڈر سے کہ جائیداد کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے؟ ہم مُلک کے لیے ہیں یا ملک ہمارے لیے ہے؟"

عابدہ :-

"شاباش، آگے چلو!"

نزہت :-

"ہندو مسلمان دو قومیں بن جائیں گی، بن کیا جائیں گی؟ ہیں! ہندو اور مسلمان، کسی معنی میں بھی ایک قوم نہیں ہیں، ہندو بُت پرست ہیں، ہم موحد، ان کے ہاں خاندان مشترکہ کا اصول ہے، ہمارے ہاں یہ ہے کہ

ایران کے نوشیروانی قالین بھی قبضہ میں آئیں، تو ٹکڑے ٹکڑے کرکے تقسیم کردو، اُن کی جنتری اور ہے، ہماری اور، ان کے ہاں، عورت کا کوئی مستقل وجود نہیں، ہمارے ہاں اسے مرد کے برابر حقوق حاصل ہیں، گانا اور ناچنا ان کا جزو مذہب ہے، ہمارے ہاں حرام ہے، ان کا تہوار ہولی اور دیوالی ہے، ہنگامہ اور رنگ آمیزی، ہمارا تہوار، عید بقر عید ہے، صرف جلالِ کبریائی اور شانِ عبودیت، وہ سود لیتے بھی ہیں، اور دیتے بھی ہیں، ہمارے ہاں دونوں کام حرام ہیں، ان کے ہاں طلاق مذہباً ناجائز ہے، ہمارے ہاں جائز ہے، ان کا مذہب عورت کو خواہ وہ ماں ہو، بیوی ہو، بہن ہو، بیٹی ہو، کچھ نہیں دیتا، ہمارا مذہب سب کے حصے مقرر کرتا ہے، ہزار ہا سال سے وہ اپنے کروڑوں ہم مذہب اور ہم قوم بھائیوں کو مذہباً اچھوت بنائے ہوئے ہیں، ہمارے ہاں محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے ہیں، ان کے اعلیٰ خاندان بھی آپس میں مذہباً رشتہ ناطہ نہیں کر سکتے، ہمارے ہاں نسل، اور نسب کا امتیاز جُرم ہے، ان کا مذہب سمندر کے سفر کی اجازت نہیں دیتا، ہمیں وہ "سیروا فی الارض" کی تعلیم دیتا ہے، وہ سبزی کھاتے ہیں، ہم گوشت کھاتے ہیں، وہ نیم عریاں لباس پہنتے ہیں، ہمارے مردوں کا لباس بھی اُن کی عورتوں سے زیادہ پردہ پوش ہوتا ہے، آخر کس چیز میں ہم اور وہ ایک ہیں؟ — ہاں ہمارے ان کے درمیان ایک چیز مشترک ہے، انسانیت، سو وہ ہر حالت میں مشترک رہے گی!"

طلعت نے کہا،

"زبان تو دیکھو اس چھوکری کی کیسی قینچی کی طرح چل رہی ہے!"

عابدہ نے ڈانٹا،

"چپ بھی رہو، ہاں نزہت، پھر کیا ہوا؟ ——"

ریحانہ بولی،

"واہ ری پگلی، کوئی کہانی سُن رہی ہے، لیکن نزہت، تم اپنی گفتگو جاری رکھو، مجھے دلچسپی ہو رہی ہے تمھاری باتوں سے!"

نزہت :-

"شکریہ، —— یہ ابھی کہہ رہے تھے، پاکستان بننے سے صدیوں کا اتحاد خاک میں مل جائے گا، یہ بھی محض وہم ہے، بھائیوں بھائیوں میں جائیداد تقسیم ہوتی ہے، مگر محبت قائم رہتی ہے، عزیزوں اور رشتہ داروں میں بٹوارہ ہوتا ہے، لیکن ان کے میل ملاپ میں فرق نہیں آتا، سچ پوچھو، تو بٹوارہ کے بعد جو اتحاد ہوتا ہے، وہی اصلی ہوتا ہے!"

عابدہ :-

"ٹھیک ہے آگے چلو۔"

نزہت :-

"خون خرابہ کا نام بھی اکثر زبانوں پر آ رہا ہے، اس سے بڑھ کر بھی کوئی دھاندلی ہو سکتی ہے، آخر کیوں ہوگا خون خرابہ؟ مسلمان آزادی کا نام نہ لیں، تب تو خون خرابہ نہیں ہوگا، انھوں نے آزادی کا نام لیا،

اور خون خرابہ شروع ہو گیا، میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی، مسلمان صرف یہی تو چاہتے ہیں کہ جہاں ان کی اکثریت ہے وہ حکومت کریں، جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہ حکومت کریں، یہ بات تو اتنی معقول ہے کہ اسے فوراً مان لینا چاہیئے، اس میں خون خرابہ کی کیا بات ہے؟"

تنویر غور سے نزہت کی باتیں سن رہا تھا، اس نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا،

"نزہت، میں تمھیں مبارک باد دیتا ہوں، اس شائستہ انداز گفتگو پر، مجھے بڑی خوشی ہوئی، کہ تم سیاست کے مسائل کو سمجھنے کی پوری پوری کوشش کرتی ہو!"

"شکریہ!"

"لیکن پھر بھی تم مجھے قائل نہیں کر سکیں!"

"اگر آپ کانگرسی لیڈروں کی طرح یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ قائل نہیں ہونگے تو واقعی میں قائل نہیں کر سکتی۔"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے!"

"پھر کیا بات ہے، فرمائیے؟"

"بات یہ ہے کہ تم نے مسئلہ کے بہت سے پہلوؤں کو چھوڑ دیا ہے"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ پاکستان ایک کمزور ریاست ہو گی۔"

"کیوں؟"

"غریب، مفلوک الحال، صنعت سے محروم، معدنیات سے خالی، یہ ہوگا تمھارا پاکستان!"

"مجھے آپ سے بالکل اتفاق نہیں ہے!"

"ہاں بھئی دھاندلی کی بات ہی اور ہے۔"

"دھاندلی نہیں کرتی، اُسے آپ کے لیے چھوڑے دیتی ہو، ــــ فرض کر لیجئے، آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے، تو کیا غریبوں کو آزاد ہونے کا حق نہیں ہے؟ وہ صرف اس لیے پیدا ہوئے ہیں کہ غلامی کی زندگی بسر کریں؟ تجارت اور صنعت سے آج پاکستان محروم ہے، لیکن کل کیوں محروم رہے گا؟ جو پاکستان خام اشیاء دوسروں کو فراہم کرسکتا ہے وہ خود ان کا استعمال نہیں کرسکتا؟ پھر یہ بھی سوچیئے، پاکستان کا دامن اگر کسی حد تک معدنیات سے خالی ہے، تو قدرت نے اسے دوسری نعمتیں بھی تو دی ہیں۔"

"ایک آدھ کا نام لو!"

"زراعت، سندھ، پنجاب اور بنگال سارے ہندوستان کے "رزّاق" بن سکتے ہیں!"

"سب سے بڑا نقصان پاکستان سے یہ ہوگا کہ وہ اپنی حفاظت نہیں کرسکے گا؟"

"کیوں؟"

"ایک چھوٹا ملک کسی بڑی حکومت کا مقابلہ کیسے کرسکے گا؟"

"کوئی وجہ نہیں ہے کہ پاکستان کسی سے جنگ کرے، لیکن اگر جنگ ہوئی، تو چھوٹے بڑے کا سوال نہیں پیدا ہوگا، جیسے حالات ہونگے ویسا نتیجہ ہوگا۔"

"یہ تو تم ایک پہیلی بجھا گئیں!"

"جرمنی کو کیسا کمزور ملک تھا؟ لیکن آج اس کا وجود کہاں ہے؟ جاپان کو کن سا بزدل، یا مفلوک الحال تھا؟ لیکن آج وہ مرحوم ہو چکا ہے، پھر یہ بھی سوچیئے کہ جرمنی نے روس جیسی عظیم الشان اور بڑی مملکت کی اینٹ سے اینٹ بجادی، لیکن اس کی بڑائی کام نہ آئی، صرف حالات نے اسے فتح مند بنا دیا، برطانیہ جیسی بے حد و نہایت حکومت کو جرمنی نے زیر و زبر کر کے رکھ دیا، اس کی جیت بڑائی سے نہیں، حکمت عملی سے ہوئی، امریکہ جیسی بے پناہ حکومت کا تختہ جاپان نے الٹ کر رکھ دیا، وہ اگر ہارا تو ایٹم بم کے زور سے، یہ تو ہوا، ایک پہلو، اب دوسرے پہلو پر غور کیجئے، چھوٹے سے چھوٹا اور کمزور سے کمزور ملک بھی اپنی آزادی برقرار رکھنا چاہتا ہے، اور کسی مضبوط سے مضبوط اور بڑے سے بڑے ملک کے زیر نگین نہیں رہنا چاہتا، کیا افغانستان کو اس لیے غلامی کا مشورہ دیں گے کہ وہ چھوٹا ہے؟ کیا ایران غلامی اس لیے برداشت کرے گا کہ وہ کمزور ہے؟ اگر یہی بات تھی تو پولینڈ جیسے چھوٹے اور کمزور ملک کے لیے یہ جنگِ عظیم کیوں شروع ہوئی تھی؟ اور اگر بڑائی، آزادی کی ضامن ہے، تو فرانس جیسی عظیم الشان مملکت کیوں آن کی آن میں سرنگوں ہو گئی تھی؟"

"لیکن ——"

"ٹھہریئے، ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی، خود کانگرس کا کیا حال ہے؟ انڈونیشیا کی تحریک آزادی کی حمایت میں کانگرسی لیڈر دھڑا دھڑ بیان دے رہے ہیں، کوئی ان سے نہیں کہتا کہ تم چھوٹے اور کمزور ہو، آزادی کا نام نہ لو، برما کی آزادی پر کوئی بھی معترض نہیں ہے، حالانکہ وہ پاکستان سے بہت چھوٹا ہے، جاپان نے صغیر ہونے کے باوجود چین جیسے کبیر ملک کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا، حالانکہ جاپان پاکستان سے بہت چھوٹا ہے۔ اور چین ہندوستان سے بہت بڑا ہے۔

میں پھر کہتی ہوں، آزاد ہونے اور آزادی کو قائم و برقرار رکھنے میں، حالات کا دخل ہوتا ہے، چھوٹائی اور بڑائی کا ذرا بھی نہیں! —— کون عقلمند شخص ہے جو مصر کو، حبش کو، شام کو، لبنان کو، یمن کو، حجاز کو، عراق کو، ترکیہ کو، البانیہ کو، یہ مشورہ دے گا کہ تم چونکہ "چھوٹے" ہو، اس لیے "کمزور" ہو، لہٰذا کسی بڑی حکومت کی غلامی قبول کر لو، وہی سامراجی منطق ہوئی، جس کے خلاف آپ جہاد کر رہے ہیں!"

"میں نہیں سمجھ سکتا کہ پاکستان کی اقتصادی بدحالی کس طرح دور ہو گی؟"

"یہ آپ اس لیے نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کا خیال ہے غلام آزاد ہونے کے بعد بھی غلام ہی رہتا ہے، حالانکہ یہ غلط ہے!"

"غلط کہہ دینا تو بہت آسان ہے، جس بات کو چاہو غلط کہہ دو۔"

"جی میں آپ کی طرح نہیں ہوں، جو کچھ کہتی ہوں، سچائی پر مبنی ہوتا ہے، ترکی کی مثال لیجیے، اس کی اقتصادی بدحالی، پاکستان سے بہت

بڑھی ہوئی تھی، صرف ملازمتوں میں مسلمانوں کا کچھ حصّہ تھا، ورنہ زندگی کے ہر میدان میں یہودی اور عیسائی سرمایہ دار چھائے ہوئے تھے، بینک ان کے، دوکانیں ان کی، تجارت کی کوٹھیاں ان کی، لین دین ان کے ہاتھ میں!"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"سُنیے ——— لیکن جب ترکی نے آزادی کی کامیاب جدوجہد کی تو آج حالت یہ ہے کہ، وہ خود کفیل ملک ہے اور تجارت، صنعت و حرفت، ہر چیز پر ترک قابض ہیں، یہودیوں اور عیسائیوں کا اجارہ ختم ہو چکا ہے یہی پاکستان میں ہوگا، غلامی سے آزاد ہونے کے بعد، ہمارا شعور، سیاسی بیدار ہوگا، اور یقیناً بہت جلد، ہم سود خوار سرمایہ داروں کے پنجہ سے رہائی حاصل کر کے، خود اپنے اقتصادیات کی تعمیر کریں گے اور کامیاب رہیں گے!"

ریحانہ نے ایک انگڑائی لی اور جوش کے عالم میں کہا،

"چاہے کوئی مانے یا نہ مانے، لیکن ہم تو قائل ہو گئے تمھارے!"

عابدہ نے چھیڑا،

"گھر پہنچ کر پھر اکھنڈ ہندوستان کا نعرہ بلند کرنے لگو گی؟"

"اب نہیں کروں گی، دیکھنا میں اب ابّا جان سے کیسی بحث کرتی ہوں"

عابدہ نے تنویر سے کہا،

"فرمائیے، آپ کی رائے کیا ہے، آپ کا بھی کفر ٹوٹا یا نہیں؟"

تنویر نے مسکرا کر کہا،

"یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اُتار دے۔"

"بجا ارشاد ہُوا، کیوں نہ ہو، وضعداری اسی کا نام ہے۔"

تنویر نے نزہت سے کہا،

"پاکستان کے قیام میں بڑی بڑی مشکلیں حائل ہیں!"

"خوب سوچ سوچ کر مشکلیں پیدا کیجئے۔"

"مذاق نہیں، واقعہ ہے، مثلاً بنگال پر پاکستان کس طرح اپنا تسلّط قائم رکھے گا؟"

نزہت نے پوچھا،

"بنگال اور پنجاب میں کتنے میل کا فاصلہ ہے؟"

"جی صرف ایک ہزار میل کا!"

"لندن اور ہندوستان میں؟"

"تقریباً پانچ ہزار میل کا۔"

"انگریز اگر لندن میں بیٹھ کر، ہندوستان پر حکومت کر سکتے ہیں، ہم پنجاب میں بیٹھ کر، بنگال سے ربط نہیں قائم رکھ سکتے؟ آخر کیوں! پھر یہ بھی سوچیے کانگرس بنگال کو پھلانگتی ہوئی آسام پر کیسے حکومت کرے گی؟"

ریحانہ تالیاں بجانے لگی، اس نے بے تاب ہو کر کہا،

"شاباش نزہت، خوب جواب دیا، قائل کر دیا تم نے حریف کو!"

عابدہ:۔

"بلکہ چھکے چھڑا دیے!"

ریحانہ:-

"بے شک!"

نزہت:-

"لیکن وہ اب بھی قائل نہیں ہوئے، یقین نہ ہو تو پوچھ لو!"

تنویر مسکرا دیا، نزہت کی سہیلیاں ہنسنے لگیں، کچھ دیر خاموش رہ کر نزہت نے تنویر سے کہا،

"اب میں ایک سوال آپ سے کرنا چاہتی ہوں۔"

"ضرور کیجئے، فرمائیے!"

"آپ نے یہ سمجھ لیا کہ پاکستان کو انگریزوں کی پشت پناہی حاصل ہے!"

"یہ تو واقعات ہیں، حقائق ہیں!"

"کیا صرف اس لیے کہ آپ کہہ رہے ہیں؟"

تنویر خاموش تھا کہ نزہت پھر بولی۔

"اگر انگریز پاکستان کے حامی ہیں تو دے کیوں نہیں دیتے؟"

عابدہ:-

ہاں بتائیے! ——— بلکہ انھوں نے مخالفت کی ہے!"

ریحانہ:-

"ابا میاں کہہ رہے تھے کہ انگریزوں نے پاکستان کو دفن کر دیا، اب

یہ مردہ کبھی زندہ نہیں ہوگا! کابینہ وفد نے اپنے اسٹیٹ پیپر میں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ پاکستان نہ بن سکتا ہے، نہ دیا جا سکتا ہے!"

تنویر نے کہا،

"پھر مسلم لیگ کیوں پاکستان کی رٹ لگائے ہوئے ہے؟"

نزہت:-

"اس لیے کہ اسے پاکستان حاصل کرنا ہے، انگریز ہندوستان کو کب آزاد کرنا چاہتے تھے، لیکن حالات سے مجبور ہو کر راضی ہوئے، اسی طرح وہ پاکستان دینا بھی نہیں چاہتے، لیکن اگر مسلمانوں میں ہمت ہے تو وہ لے کر رہیں گے! انگریز سمجھنے لگے ہیں کہ پاکستان ایک غلط چیز ہے؟"

تنویر "جی نہیں، یہ بات نہیں ہے، اگر یہ بات ہوتی تو سب سے پہلے وہ اپنے السٹر کو مشورہ دیتے کہ آئرلینڈ سے مل جاؤ، جہاں تمدن، زبان، معاشرت، مذہب، کسی چیز کا اختلاف نہیں ہے اور پھر سوڈان مصر کے حوالے کر دیتے، جو مصر تھا، اور ہے، اور اس کے بعد فلسطین میں یہودی حکومت کا تصور اسے آزاد کر کے ختم کر دیتے، لیکن وہ السٹر، اور آئرلینڈ کی غیر فطری تفریق قائم رکھنا چاہتے ہیں، وہ مصر اور سوڈان میں افتراق پیدا کرنے کے درپے ہیں، وہ فلسطین کو اس وقت تک آزاد نہیں کریں گے جب تک، وہاں یہودی حکومت قائم کر کے اس کے ٹکڑے نہیں کر دیں گے، لیکن وہ ہندوستان کو زبردستی متحد رکھنا چاہتے ہیں، حالانکہ ان دونوں میں اشتراک کی وجہ نہیں ہے، آپ جانتے ہیں

انگریز ایسا کیوں کر رہے ہیں؟"

"بتائیے!"

"اس لیے کہ وہ ہندوستان کو، ہر حالت میں خوش رکھنا چاہتے ہیں، وہ انگریزی مال کی سب سے بڑی منڈی ہے، وہ دیوالیے ہو رہے ہیں، انھیں ہندوستان سے سرمایہ کی بھی امید ہے، پاکستان میں انھیں یہ سہولتیں نہیں ہوں گی، لہٰذا وہ پاکستان دے کر ہندوستان کی خفگی کیوں مول لیں؟"

ریحانہ:-

"بالکل ٹھیک!"

طلعت:-

"بات تو یہی ہے!"

عابدہ:-

"آپ آخر چُپ کیوں بیٹھے ہیں؟"

"کچھ بولیئے نا!"

تنویر:-

"میرا چُپ رہنا ہی بہتر ہے!"

"آخر کیوں؟"

"کون سُنتا ہے فغانِ درویش"

"ہم سنیں گے، کہیئے، فرمائیے!"

ریحانہ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی اور کہا،
"افوہ، دس بج گئے، باتوں باتوں میں!"
طلعت گھبرا گئی،
"بڑا غضب ہو گیا، آج امّی ضرور خفا ہوں گی!"
عابدہ اٹھ کھڑی ہوئی،
"ہاں بھئی اب اُٹھو مجلس پھر جمے گی کسی دن!"
یہ قافلہ رنگ و بُو روانہ ہو گیا، ان سب کو رخصت کر کے واپس آتے وقت
تنویر نے راستہ کی تنہائی سے فائدہ اٹھا کر نزہت سے پوچھا،
"تم مجھ سے نفرت تو نہیں کرنے لگیں؟"
نزہت نے پوچھا،
"یہ خیال آپ کے دل میں کیوں آیا؟"
"میرے خیالات تو تمھیں سخت ناپسند ہیں!"
"ہاں، لیکن آپ نہیں!"

گرم گرم باتیں

نزہت صحت کی ذرا بھی پروا نہیں کرتی تھی، پرہیز اور احتیاط کا خیال اس کے نزدیک ناقابلِ معافی جرم تھا، اس معاملہ میں نہ وہ ماں کی سنتی تھی، نہ باپ کی، ابھی چند روز ہوئے اس کا غسل صحت ہوا تھا، لیکن بدپرہیزی اور بے پروائی کے سبب وہ پھر بیمار پڑ گئی، بخار آنے لگا، دو ہی تین روز میں اتنی کمزور ہو گئی کہ چارپائی سے لگ گئی۔

ڈاکٹروں کی تشخیص تھی کہ یہ کوئی خطرناک قسم کا بخار ہے، اگر علاج اور پرہیز کا سلسلہ جاری رہا، تو چند روز میں طبیعت روبہ اصلاح ہو جائے گی، لیکن تنویر گھبرا گیا، وہ بڑے مضبوط دل کا آدمی تھا، جنگ کے میدان میں اس کے سامنے لاشوں پر لاشیں گرتی تھیں، لیکن وہ گولیوں کی بوچھاڑ اور گولوں کے دھماکے کی پروا کیے بغیر برابر آگے بڑھتا رہتا تھا وہ موت سے بالکل نہیں ڈرتا تھا، اس کا خیال تھا، موت صرف ایک بار آتی ہے، اور جب آجاتی ہے، تو واپس نہیں جاتی، لہٰذا، اس سے ڈرنا کیا، لیکن نزہت کے معاملہ میں وہ بڑا بزدل تھا، اس کی طبیعت خراب ہوئی، اور یہ اندیشہ ہائے دُور و دراز میں مبتلا ہوا، ڈاکٹروں کے اطمینان

دلانے کے بعد بھی وہ مطمئن نہ ہُوا، اس کے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا، اگر خدانخواستہ نزہت اچھی نہ ہوئی تو ——؟

اس لیے نزہت کی تیمارداری کا کام اس نے اپنے ذمہ لے لیا تھا، وہ راحت اور آرام سے بے نیاز ہو کر اپنی محبوبہ کی تیمارداری میں لگا ہُوا تھا، اپنے ہاتھ سے اسے دوا پلاتا تھا، اپنے سامنے پرہیزی کھانا کھلاتا تھا، اصرار کر کر کے سونے پر مجبور کرتا تھا، باتیں کرنے اور کتابیں پڑھنے کی بھی اس نے ممانعت کر دی تھی۔

اب نزہت کی طبیعت ذرا سنبھل چلی تھی، تنویر حسب معمول ایک کرسی پر بیٹھا ہُوا تھا، نزہت نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں، تنویر نے ٹوکا،

"تم باتیں مت کرو، آرام سے چپ چاپ لیٹی رہو، یہی ڈاکٹروں کا حکم ہے!"

وہ جل کر بولی،

"بھاڑ میں جائیں آپ کے ڈاکٹر، میں باز آئی ایسے علاج سے، کم بختوں نے میرے منہ پر تالا لگا دیا ہے، بات بھی نہیں کر سکتی!"

تنویر نے بڑے پیار سے کہا،

"ابھی بہت کمزور ہو، خاموش لیٹا رہنا ہی تمھارے لیے بہتر ہے!"

"لائیے کوئی کتاب دیجئے، وہی پڑھوں۔"

"کتاب بھی نہیں۔"

"یا اللہ، آخر کیوں؟"

"اس سے بھی تکان ہو جائے گی!"

"اچھا تو آپ کچھ باتیں کیجئے!"

"ہاں میں تیار ہوں، کہانی سناؤں کوئی، ایک تھا راجہ ——"

"اپنی گرفتاری اور سزایابی کے حالات سنائیے!"

تنویر نے اپنی آپ بیتی سنانی شروع کی، سنگاپور میں پہنچنا، جاپانیوں سے لڑائی، گرفتاری، قیدیوں کے کیمپ کے حالات، پھر آزاد ہند فوج کی شرکت، امفال کا مورچہ، انگریزوں کے ہاتھ گرفتاری، شدائد و مصائب، عدالت، رہائی، ساری داستان سُناڈالی، نزہت غور سے ایک ایک حرف سنتی رہی، اس سے قبل بھی، تنویر، ایامِ جدائی کے واقعات جستہ جستہ سُنا چکا تھا، لیکن آج پوری کہانی جو سنائی تو پورے ربط اور تسلسل کے ساتھ، اس کے مصائب کا پورا نقشہ، نزہت کے سامنے آگیا، وہ تنویر کی لرزہ خیز بپتا سُن کر رونے لگی، اُسے روتا دیکھ کر تنویر نے کہا،

"یہ کیا غضب کر رہی ہو نزہت؟ —— تم رو کیوں رہی ہو؟

نزہت نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا،

"کاش، میں نے بھی آپ کی ان مصیبتوں میں حصّہ لیا ہوتا!"

"اگر تم حصّہ نہ لیتیں تو میں زندہ کیسے رہتا؟ وہ تمھاری یاد تھی، جو ہر مصیبت میں میری دم ساز تھی، وہ تمھارا تصوّر تھا، جو مجھے زندہ رہنے کے لیے اُکساتا تھا، وہ تمھاری من موہنی صورت تھی، جو آنکھوں کے سامنے آکر میرے دل میں بڑی سے بڑی اور ہولناک سے ہولناک مصیبت کے جھیل لے

جانے کا حوصلہ پیدا کر دیتی تھی، اگر تم میری ان مصیبتوں میں حصّہ نہ لیتیں تو میں دیوانہ ہو جاتا۔"

نزہت نے محبّت سے بھری ہوئی ایک نگاہ تنویر پر ڈالی، اور کہا،

"خدا کا شکر ہے مصیبتوں کا دور ختم ہو گیا!"

"ہاں صرف ایک دورِ استقبال کے پردہ میں کیا ہے اسے کون جان سکتا ہے۔"

ان الفاظ سے نزہت سہم گئی، وہ گھبرا کر بولی،

"آپ کا مطلب کیا ہے ان باتوں سے؟ کیا پھر کچھ ارادہ ہے؟"

"ارادہ نہیں، عزم، فیصلہ!"

نزہت کے دل میں ہول پیدا ہوئی، نہ جانے کیا فیصلہ کر لیا ہے، اس دیوانے نے، سہمے ہوئے انداز میں کہا،

"کاہے کا فیصلہ؟ کیسا عزم؟"

"ملک کو آزاد کرانے کا، جب تک ہندوستان غلام ہے ہماری زندگی موت سے بدتر ہے!"

نزہت مسکرائی، اس نے کہا،

"توبہ، آپ نے تو مجھے ڈرا دیا تھا، میں گھبرا گئی، نہ جانے کیا ارادہ کر بیٹھے ہیں آپ، بڑا مبارک ارادہ ہے، ملک کی آزادی کے لیے جد و جہد کرنا ہر محبِّ وطن کا سب سے پہلا اور آخری فرض ہے ——!"

"تم بھی اس جنگ میں میرا ساتھ دو گی؟"

بڑے چاؤ سے تنویر نے پوچھا، لیکن نزہت نے سنجیدگی سے جواب دیا

"مشکل ہے!"

"کیوں؟"

"میں ایسی جنگ میں حصّہ نہیں لے سکتی جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ایک قوم آزاد ہو جائے اور دوسری غلام بن جائے۔"

"تم کیسی باتیں کرتی ہو نزہت؟ انگریز چلے جائیں گے، تو صرف ہندو ہی آزاد نہیں ہوں گے، مسلمان بھی آزاد ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے، لیکن انگریز کی غلامی سے آزاد ہو کر غیر مسلم اکثریت کے غلام بن جائیں گے۔"

"کیوں بن جائیں گے؟ دس کروڑ مسلمانوں کو غلام کون بنا سکتا ہے انھیں کسی نے غلام بنانے کی کوشش کی، تو سب سے پہلا شخص میں ہوں گا، جو اس سے لڑنے کے لیے میدان میں اترے گا!"

"آپ سپاہی ہونے کے باوجود جذباتی باتیں بہت کرتے ہیں — اگر چالیس کروڑ ہندوستانی غلام بنائے جا سکتے ہیں، تو دس کروڑ مسلمان کیوں نہیں غلام بنائے جا سکتے؟ رہا، آپ کا میدان جنگ میں اترنا، تو یاد رکھیے غلام بن جانے کے بعد اگر آپ جنگ کا نام لیں گے تو گولی سے اڑا دیے جائیں گے!"

"کیوں؟"

"باغی کی سزا یہی ہے! — ہم اپنی آزادی کی جد و جہد اس وقت کر سکتے ہیں، جب کہ غیر مسلم قومیں بھی اسی کش مکش میں مبتلا ہیں، لیکن اگر غیر مسلم اقتدار قائم ہو جائے، تو آپ ہرگز جنگ نہیں کر سکتے، آپ کے ہاتھ پاؤں بندھ

چکے ہوں گے، آپ کے گلے میں غلامی کا طوق پڑ چکا ہوگا۔"

"لیکن نزہت سوچو تو، وہ آزادی ہر ہندوستانی کے لیے ہوگی، ہندو، مسلم، عیسائی، پارسی کا سوال ہی نہیں ہوگا!"

"میں نہیں مانتی اسے!"

"وہی زبردستی!"

"زبردستی بالکل نہیں، آپ ایک بات کو بھول جاتے ہیں، ہندوستان میں جتنی قومیں بستی ہیں، وہ ہندوؤں میں جذب ہو چکی ہیں، ہندوستانی عیسائیوں کے نام ہندوؤں کے سے ہوتے ہیں، سکھ گویا ہندو ہی ہیں، پارسی بھی آدھے ہندو ہیں، اچھوت اور ادیباسی لاکھ کہیں ہم ہندو نہیں، لیکن دنیا انھیں ہندو مانتی ہے، البتہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتنا اور ایسا فرق ہے کہ ان دونوں کو ایک نہیں کہا جا سکتا، آزاد ہندوستان میں اکثریت، ان لوگوں کی ہوگی، جو کسی نہ کسی سے مذہب سے وابستہ ہونے کے باوجود، لادین تمدن معاشرت، اور نظام حیات کے قائل ہیں اور اقلیت مسلمانوں کی ہوگی، جو ہر معاملہ کو دین کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، اصول حیات کا یہ تصادم، وحدتِ ہند کی صورت میں مسلمانوں کو غلام بننے پر مجبور کرے گا!"

"آخر کیسے؟"

نزہت نے یہ سوال گویا سنا ہی نہیں، سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا،

"ہاں ایک صورت ہے مسلمانوں کے لیے، وہ یہ کہ وہ بھی پارسیوں، عیسائیوں اور سکھوں کی طرح، اپنی انفرادیت ختم کر کے اکثریت کے قانون،

اصول کو اپنا لیں، اگر وہ یہ نہیں کرنا چاہتے، تو ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ اپنی ایک آزاد حکومت قائم کریں، جہاں کوئی سارداہل نہ بنا سکے، جہاں کوئی ہائیکورٹ، کسی مسلمان عورت کو غیر مسلم شوہر کے عقد میں رہنے پر مجبور نہ کر سکے، جہاں جبری ابتدائی تعلیم کے ساتھ ناچ اور گانے کی جبری تعلیم نہ دی جا سکے، جہاں تھیٹر، فلم اور آرٹ کے سحر طراز ناموں کو، اخلاق انسانی پر ڈاکہ زنی کی عام اجازت نہ ہو، جہاں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین نافذ نہ ہوں، بلکہ اس کا قانون نافذ ہو جس نے انسانوں کو بنایا ہے، جہاں اگر جنگ لڑی جاتی ہو تو وطن نامی زمین کے ٹکڑے کے لیے نہیں، بلکہ خدا کے لیے، جہاں کوئی اسٹاک ایکسچینج نہ ہو، جہاں شیئر بازار نہ ہو، جہاں سودی کاروبار کرنے والے بنک اور ساہوکارے نہ ہوں ــــ"

تنویر نے ایک پرزور قہقہہ لگایا۔

"واہ بھئی واہ، تم تو چھپی رستم نکلیں، ایسا معلوم ہوتا ہے ۱۶ء کے مولانا ابوالکلام آزاد بول رہے ہیں۔"

"مولانا ابوالکلام آزاد ۱۶ء میں کچھ اور ہو سکتے ہیں اور ۴۶ء میں کچھ ہو، اور لیکن سچائی جو ۱۶ء میں تھی وہی ۴۶ء میں بھی ہے اور قیامت تک وہی رہے گی۔"

تنویر نے سگریٹ سلگا کر ایک بڑا کش لگایا، اور نزہت کو چھیڑتے ہوئے کہا،

"لیکن یہ تو بتاؤ یہ ۱۳سو برس پہلے والی حکومت کی جو مقدس تصویر

تم نے کھینچی ہے، اس میں رنگ کون بھرے گا؟ مسٹر جناح؟ جو یہ بھی نہیں جانتے، نماز پانچ بار پڑھی جاتی ہے یا دس بار؟"

نزہت نے اسی لب و لہجہ میں جواب دیا،

"ممکن ہے وہ نہ جانتے ہوں، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہوتا، اسی سے تو سب کچھ ہوتا ہے، کھا گئیں تم مات یہاں!"

"بالکل نہیں ——— زمانہ خود اپنی ضرورت کے مطابق لوگوں کو پیدا کرتا رہتا ہے، آج مسٹر جناح کی ضرورت ہے، کل کوئی مولینا محمد علی پیدا ہو جائے گا، انگریزوں کو جب تک چرچل کی ضرورت تھی وہ اسے سر تاج بنائے رہے، جب ضرورت پوری ہو گئی اور وہ ان کے مقاصد کے لیے مفید نہ رہا، انھوں نے بے تامل اسے بے دخل کر کے ایٹلی کو اپنی جیون نیا کا کھیون ہار بنا لیا، ہمیں آج مسٹر جناح کی ضرورت ہے، کل پاکستان کے قیام کے بعد اگر وہ، ہمارے ساتھ نہ چل سکے، تو خدا ہمیں ان سے بہتر لیڈر دے گا!"

تنویر نے زچ ہو کر کہا،

"بڑی ضدی ہو نزہت!"

"ضدی تو نہیں ہوں، ہاں میرے اندر استقلال ضرور ہے ——— سوچ سمجھ کر جو رائے قائم کر لیتی ہوں، اس سے پھر ہٹتی نہیں!"

"تو مطلب یہ کہ آپ پاکستان قائم کر کے دم لیں گی؟"

"کیوں نہیں، انشاء اللہ ضرور!"

"اب ایک سوال اور رہے، اس کا جواب دیجئے!"

"فرمائیے!"

"ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کیسے ہوں گے؟"

"بڑے اچھے!"

"مجھے اس کی امید نہیں، جب اب مخالفت اور عناد کا یہ حال ہے، تو آزادی کے بعد پانی پت کے میدان میں ایک جنگ ضرور ہو کر رہے گی!"

"یہ آپ کا نہیں بہتوں کا خیال ہے، لیکن میرے خیال میں بالکل غلط ہے!"

"پھر وہی بے دلیل فیصلہ!"

"بتائیے کیوں جنگ ہو گی؟ اس وقت مخالفت اور عناد جو ہے، وہ تو اس لیے ہے کہ ہندو یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان ان کی آزادی کے راستہ میں حائل ہیں اور مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ ہندو انھیں اپنا غلام بنا لینا چاہتے ہیں لیکن جب یہ غلط فہمی رفع ہو جائے گی اور دونوں آزاد ہو جائیں گے تب نہ مخالفت باقی رہے گی، نہ عناد! دونوں ایک دوسرے کے دکھ درد کے شریک رہیں گے!"

"کچھ بھی ہو، پہلے ہندوستان کو آزاد ہونا چاہیئے، پھر پاکستان بنتا رہے گا!"

"پھر کیوں ساتھ ساتھ کیوں نہیں؟"

نزہت نے تھرمامیٹر اٹھا کر منہ میں لگایا، وہ اسے دیکھ رہی تھی

کہ تنویر نے جلدی سے اسے لے لیا اور گھبرا کر کہا،

"ارے تمھیں پھر حرارت ہو گئی!"

نزہت نے تکیہ پر سر رکھ کے کہا،

"اتنی دیر سے بک بک کر رہی ہوں، حرارت تو آنی ہی چاہیئے، آپ کے سر میں درد بھی ہونے لگا ہو گا؟"

"یا تو میں تمھیں بات کرنے بھی نہیں دیتا تھا، یا اتنی لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی، لاحول ولاقوۃ، میں بھی عجیب آدمی ہوں!"

نزہت مسکرانے لگی، ان مسکراتی ہوئی آنکھوں میں محبت کا سمندر لہریں مار رہا تھا۔

نیا واقعہ

نزہت کا بخار تو جاتا رہا تھا مگر کمزوری ابھی باقی تھی، عابدہ، ریحانہ اور طلعت مزاج پرسی کے لیے آئی تھیں، اور گھیرے بیٹھی تھیں جیسے ستارے چاند کو اپنے جھرمٹ میں لے لیتے ہیں، یہ سہیلیاں آپس میں چہلیں کر رہی تھیں، کبھی عابدہ نے ریحانہ پر فقرہ کس دیا، کبھی طلعت نے نزہت پر چوٹ کر دی، اتنے میں خادمہ چائے لے کر آئی، عابدہ نے ٹرے اپنی طرف کھینچا اور سب کو چائے بنا بنا کر دینے لگی،

اسی دوران میں تنویر ادھر سے گذرا، دروازہ تک آیا اور الٹے پاؤں لوٹنے لگا، شاید نزہت کے پاس آیا تھا، عابدہ بھلا کب چپ رہنے والی تھی،

"ذرا سنیے تو!" عابدہ نے پکارا،

تنویر لوٹ آیا۔

"آپ چلے کیوں گئے؟ اگر ہم لوگ مخل ہو رہے ہوں تو لیجئے چلے جاتے ہیں، آیئے تشریف رکھیئے ——— چلو سکھیو، چلیں، کسی کا دل دکھانا اچھا

نہیں ہوتا!" عابدہ نے کہا،

"کچھ دیوانی ہوئی ہے! بیٹھ!" نزہت نے عابدہ کو گھسیٹ کر بٹھاتے ہوئے کہا،

وہ بیٹھ گئی، تنویر اب تک کھڑا تھا،

"آپ بھی بیٹھ جائیے نا!" نزہت نے کہا،

وہ بیٹھ گیا، عابدہ نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھائی،

"شوق فرمائیے!"

وہ گھبرا گیا، اس نے کہا،

"شکریہ، میں چائے نہیں پیتا!"

"سُنتی ہو نزہت! یہ چائے نہیں پیتے، خدا جھوٹ نہ بلائے، دن میں کم از کم دس مرتبہ تو چائے پیتے ہوں گے!"

"پیتا تو ہوں، لیکن اس وقت نہیں پیوں گا۔"

"ہاں ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی، آج تو آپ کو چائے پینے کے بجائے مٹھائی کھانی چاہیئے!" عابدہ نے مسکراتے ہوئے کہا،

"جی مجھے کوئی عذر نہیں، لیکن اس فرمائش کا سبب تو معلوم ہو!"

"سبب بھی ہم بتائیں؟"

"بتانا ہی پڑے گا!"

"اچھا سُن لیجئے، جواہر لال جی نے عارضی حکومت بنالی اور بی نزہت کے قائد اعظم منہ دیکھتے رہ گئے!"

تنویر مسکرایا،

"مٹھائی بعد میں کھائیے گا پہلے کالی جھنڈیاں تو لگائیے!"

"کالی جھنڈیاں، کس کا دل گردہ ہے کہ اس گھر میں لگائے! افتخار بابا ہاتھ توڑ دیں گے اس کے، یہ بی نزہت باپ کی اتنی چہیتی اور لاڈلی ہیں، جب دیکھو جب ان سے کانگرس اور مسلم لیگ پر بحث بھی کرتی رہتی ہیں — لیکن اتنی ہمت ان میں بھی نہیں کہ کالی جھنڈیاں گھر تو گھر، اپنے کمرہ میں لگالیں، ہاں یہ دوسری بات ہے کالے رنگ کا ماتمی دوپٹہ اوڑھ لیں!"

اب نزہت سے چپ نہ رہا گیا، بولی،

"ابّا جان بھی کچھ زیادہ خوش نہیں اس حکومت سے!"

تنویر! "کیوں؟ وہ تو ضلع کانگرس کے صدر ہیں!"

نزہت! "اس سے کیا ہوتا ہے، کہہ رہے تھے، ہمارے لیڈر بھی، کیسی کیسی غلطیاں کرتے ہیں، مسلم لیگ کو نہیں لیا تھا تو خیر، لیکن اس کی جگہ پر دوسرے مسلمانوں کو لینا تھا تو وہ نیشنلسٹ تو ہوتے، لیا ہے کسے؟ شفاعت احمد اور علی ظہیر کو، ایک سرکاری خطاب یافتہ، دوسرا پرانا لوڈی!"

تنویر! "ہاں بھئی اس اعتراض کو ہم بھی مانتے ہیں، یہ غلطی ہوئی!"

ریحانہ بولی،

"ہمارے گھر میں بھی اس کا چرچا ہو رہا تھا، سب یہی کہتے ہیں یہ لوگ مسلم لیگ کو چڑانے کے لیے گئے ہیں!"

عابدہ نے چہرہ پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس میں چڑنے کی کیا بات ہے ؟ اور یوں چڑتی ہے تو چڑا کرے مسلم لیگ !"

ریحانہ نے جواب دیا۔

"چڑنے کی بات یہ ہے کہ ان میں سے ایک صاحب تو وہ ہیں جنھوں نے مسلم لیگ کے حکم پر اپنا خطاب واپس نہیں لیا، اور اس سے اسی وجہ سے الگ ہو گئے، دوسرے صاحب وہ ہیں جنھوں نے ملک یا قوم کے لیے کبھی حوالات تک کی زحمت نہیں گوارا فرمائی، مگر وزیر بنا لیے گئے !"

طلعت :-

"چھوڑو بھی یہ قصہ، ہمیں ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں !"

عابدہ :-

"پھر ہندوستان میں پیدا کیوں ہوئیں ! وہاں پیدا ہوتیں جہاں کی باتوں سے دلچسپی ہوتی !"

طلعت :-

"یہ لو، اب میرے پیچھے پڑ گئیں۔"

نزہت :-

"مجھے تو ایک بات کی خوشی ہے !"

عابدہ :-

وہ کون سی خوش قسمت بات ہے ؟ ذرا ہم بھی سنیں !"

نزہت :-

"جو لوگ کہا کرتے تھے مسلم لیگ، عہدوں کی بھوکی ہے، انھیں لب لاجواب ہو جانا پڑے گا! عہدوں کی بھوکی ہوتی تو اس شان سے ٹھکرا نہ دیتی وزارت کو!"

تنویر:-

"لیکن وہ گڑبڑ سے بھی تو باز نہیں آتی، اب "یوم عمل اقدام" منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں، خدا خیر کرے۔"

نزہت:-

"اس سے کیا ہوتا ہے؟ یہ تو ہر جماعت کا جمہوری حق ہے، کانگرس اگر حکومت برطانیہ کے خلاف سول نافرمانی کر سکتی تھی، تو مسلم لیگ کانگرسی حکومت سے کیوں نہیں لڑ سکتی؟"

عابدہ:-

"میں کہتی ہوں لڑائی سے کیا حاصل؟"

طلعت:-

"یہی میں بھی کہتی ہوں!"

تنویر:-

"یہی قول میرا بھی ہے، مل جل کے رہو، یہی شانِ انسانیت ہے۔"

نزہت:-

"جب ایک قوم کی نمائندہ جماعت کو نظر انداز کر دیا جائے، اور اس کے باغیوں کو سرفراز کیا جائے، اس کے جائز مطالبات ٹھکرا دیے جائیں

اس کی توہین کی جائے، اسے طعنے دیے جائیں، اسے دُور رکھنے کی کوشش کی جائے، تو وہ لڑ کر اپنے مطالبات نہ منوائے تو کیا کرے ؟"

ریحانہ :-

"مجھے تو زمانہ کے انقلاب پر حیرت ہوتی ہے، جو لوگ کل تک انگریزوں کے خلاف جنگ کر رہے تھے، آزادی کے نعرے لگا رہے تھے، آج وہ بادشاہ سلامت کی وفاداری کا حلف اٹھا رہے ہیں اور لارڈ ویول کے ماتحت کام کر رہے ہیں!"

عابدہ :-

"زمانہ کے انقلاب پر مجھے بھی حیرت ہوتی ہے، کل تک جو لوگ انگریزوں کی ناک کے بال بنے ہوئے تھے، اور لارڈ ویول، جن کے ساتھ کانا پھوسی کیا کرتے تھے، وہ آج دودھ کی مکھی کی طرح نکال دیے گئے، کوئی بات بھی نہیں پوچھتا بیچاروں کی!"

نزہت :-

"تمہارا اشارہ اگر مسلم لیگ کی طرف ہے ——"

عابدہ :-

ہاں ہے تو اسی کی طرف، ——"

نزہت :-

"تو تم جھوٹ بولتی ہو، قائد اعظم نے جب سے کام شروع کیا ہے، کبھی بھی مسلم لیگ نے انگریزوں سے ساز باز نہیں کی، اس کے پیش نظر صرف

مسلمانوں کی آزادی ہے، اس مقصد کے لیے وہ ہر ایک سے جنگ کر سکتی ہے اور ہر ایک سے صلح کر سکتی ہے!"

تنویر:-

"جنگ ہندوؤں سے، صلح انگریزوں سے!"

نزہت:-

"یہ بھی غلط! قائدِ اعظم نے بار بار کانگرس کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا، لیکن وہ جھٹک دیا گیا، انھوں نے ہمیشہ یہ کہا، آؤ صلح کر لیں، پھر ہم تم مل کر، انگریزوں کو اس دیس سے نکال دیں، مسلم لیگ تو آج بھی انگریزوں سے جنگ کر رہی ہے، وہ دوسرے لوگ ہیں جو ان سے سودا کر رہے ہیں۔"

عابدہ پھر کچھ کہنے والی تھی کہ طلعت اٹھ کھڑی ہوئی،

"بھئی ہم تو اب چلیں گے، بہت دیر ہو گئی۔"

نزہت نے کہا،

"کچھ دیر تو اور بیٹھو!"

"اب نہیں، پھر کسی دن۔"

طلعت اٹھی تو اس کے ساتھ ریحانہ اور عابدہ بھی اٹھ کھڑی ہوئیں، اب کمرہ میں صرف تنویر اور نزہت رہ گئے۔

تنویر نے کہا،

"اب پھر تم نے خوب زوردار بحث کی ہے، مجھے ڈر ہے کہیں طبیعت نہ خراب ہو جائے۔"

"اب میں اچھی ہوں۔"

"میں اس وقت ایک خاص بات کہنے آیا تھا!"

نزہت سنبھل کر بیٹھ گئی،

"کہیئے!"

"کل میں جا رہا ہوں!"

نزہت کا چہرہ سفید پڑ گیا، وہ بولی،

"ابھی سے؟ ابھی تو میں پورے طور پر تندرست بھی نہیں ہوئی!"

تنویر نے، نزہت کی الفت کا یہ رنگ دیکھ کر جوشِ مسرت کو سنبھا

اور کہا،

"لاہور نہیں، کلکتہ، صرف چند روز کے لیے!"

"کیوں؟ خیریت تو ہے؟"

"وہاں آزاد ہند فوج کی ایک کمیٹی کا جلسہ ہے!"

"کب واپس آئیے گا؟"

"دس بارہ دن میں ـــــ تم مجھے یاد کرو گی نزہت؟"

نزہت کے سفید چہرہ پر سرخی دوڑ گئی، اس نے شرماتے ہو

لہجہ میں کہا،

"اور آپ؟"

"میں؟"

"ہاں، بتائیے، اور آپ؟"

بے شک میں جا رہا ہوں، لیکن اپنی روح یہیں چھوڑ کر، کہیں بھی رہوں،
دل تمہارے پاس رہے گا۔"

وہ کچھ دیر تصویر کو دیکھتی رہی، پھر نظر جھکا کر بولی،

"عید آپ کہاں کریں گے؟

"جس دن میں یہاں آجاؤں گا، وہ میرے لیے عید ہی کا دن ہوگا چاہے
عید سے پہلے آؤں یا بعد!"

نزہت نے رُکتے رُکتے کہا،

"کچھ بھی ہو، عید یہیں کرنی پڑے گی آپ کو!"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا! تم حکم دو اور میں اس کی تعمیل نہ کروں؟"

آگ

کلکتہ کانفرنس میں سب سے اہم زیر بحث سوال یہ تھا کہ آزاد ہند فوج کے زندانیوں کو کس طرح رہائی دلائی جائے اور جو بے کاری اور بے روزگاری پیدا ہو چکی ہے اسے کس طرح دور کیا جائے، اس سلسلہ میں متعدد تجویزیں زیر بحث آئیں، تنویر نے تجویز پیش کی، رضا کاروں کی ایک آل انڈیا جماعت قائم کی جائے جو ملک میں ضبط و نظم اور امن و امان کی بحالی کا کام کرے، یہ جماعت انڈین نیشنل کانگرس سے وابستہ کر دی جائے، میجر جنرل شاہ نواز، اور کیپٹن سہگل نے بھی اس تجویز کی پر زور تائید کی، اور بالآخر یہ منظور کر لی گئی۔

تنویر اپنے جماعتی کاموں میں الجھا ہوا تھا، لیکن نزہت کی یاد سے غافل نہیں تھا، اس کے دوست احباب، تھیٹر دیکھتے تھے، سینما سے دل بہلاتے تھے، ناچنے والیوں کا ناچ دیکھتے تھے، گانے والیوں کا گانا سنتے تھے، زندگی کی دلچسپیوں میں پورا حصہ لیتے تھے، . . . . . .

لیکن وہ زاہد خشک بنا ہوا تھا، اس کے دل کی جنت نزہت تھی، اور نزہت کے بغیر دنیا کی ہر دلچسپی جہنم تھی، جب سے اس نے،

نزہت کو دیکھا تھا، اس کا عشق کئی گنا بڑھ گیا تھا، وہ چاہتا تھا، جلد از جلد نزہت کو اپنا بنالے، اور خود اس کا ہو رہے، لیکن جو عہد دل ہی دل میں وہ نیتاجی سے کر چکا تھا، وہ اُسے یاد تھا، اس نے فیصلہ کر لیا تھا، شادی اسی وقت کرے گا، جب ہندوستان آزاد ہو جائے گا، جتنا جتنا وہ ملک کے لیڈروں کو، جنگ زرگری میں مبتلا دیکھتا تھا، اتنا اتنا اس کا جذبہ تیز سے تیز تر ہوتا جاتا تھا، وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کو بے قرار تھا، مگر یہ لیڈر انگریز کے بچھائے ہوئے، دام میں گرفتار ہو گئے تھے، یہ آزادی حاصل کرنے کے بجائے آپس میں لڑ رہے تھے، آخر ہندوستان کب آزاد ہو گا، نزہت میرے دل کا ویرانہ کب آباد کرے گی ؟

عید میں صرف چند دن باقی رہ گئے تھے، تنویر نے، سامانِ سفر باندھنا شروع کیا، دوستوں نے اصرار کیا، عید کی بہار کلکتہ میں دیکھ جاؤ۔ مولانا آزاد سبحانی کا فصیح و بلیغ خطبہ سنو، یہ نعمت تمھیں پٹنہ میں کہاں حاصل ہو گی ؟ اس نے جواب دیا، میری عید پٹنہ کے سوا کہیں اور ہو ہی نہیں سکتی، عین اس وقت جب وہ سامانِ سفر باندھ کر اسٹیشن روانہ ہو رہا تھا، صوبہ کانگریس کے صدر بابو کرشن شنکر رائے نے ٹیلیفون پر درخواست کی، چند روز کے لیے اپنا سفر ملتوی کر دیجئے، کلکتہ کے حالات اشتعال انگیز صورت اختیار کر رہے ہیں، اس وقت بڑھتے ہوئے رضا کاروں کی، اور سمجھے ہوئے سالاروں کی سخت ضرورت ہے، "یوم عملی اقدام" کے بعد آپ

تشریف لے جائیے گا۔

تنویر اپنی کسی ضرورت سے ایک گھنٹہ بھی کلکتہ میں نہیں ٹھہر سکتا تھا، لیکن ملک کے لیے، وہ ساری زندگی، نزہت سے دُور رہ کر گذار سکتا تھا، اس نے بے تامل جواب دیا، آپ کے ہر حکم کی تعمیل میرا فرض ہے، اس کام کے لیے چند روز نہیں، زندگی بھر ٹھہر سکتا ہوں۔

کلکتہ میں ہندو اور مسلمان ایسا معلوم ہوتا تھا، لڑنے اور مرنے پر تُلے ہوئے ہیں، آبادی زیادہ تر مخلوط تھی، ہندو اور مسلمان ملی جلی بستیوں میں رہتے تھے، جھنڈے بازی کا آمنے سامنے مقابلہ جو ہُوا، تو کافی اشتعال پیدا ہوگیا، ہندو یہ سمجھ کر خوش تھے کہ ہندوستان آزاد ہو رہا ہے، مسلمان یہ سمجھ کر برہم تھے کہ وہ غلام بنائے جا رہے ہیں، کسی نے ایک دوسرے کو سنانے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، مخالفانہ جذبات کا ایک دھارا تھا جس میں سب بہے جا رہے تھے۔

ایک روز دفعتہً، کلکتہ کے امن دامان میں آگ لگ گئی، چنگاری کئی دن سے بھڑک رہی تھی، اب وہ شعلۂ جوالہ بن گئی، سارا شہر اس آگ کی لپیٹ میں آگیا، انسان درندے بن گئے، معصوم بچّوں کو ماؤں کی گود سے چھین چھین کر قتل کیا گیا، عصمت مآب عورتوں کی آبرو ریزی کی گئی۔ جوانوں اور بوڑھوں کو، پکڑ پکڑ کر، گاڑیوں سے کھینچ کھینچ کر، کلہاڑیوں، ہتھوڑوں، کرپانوں اور تلواروں سے قتل کیا گیا، سامان لوٹ لیا گیا، نوٹ

جلا دیے گئے، گھروں میں آگ لگا دی گئی، ہندو کو ہر مسلمان سانپ نظر آرہا تھا جس کا جلد سے جلد، سر کچل دینا چاہیئے، مسلمان کی نظر میں ہر ہندو ایک خونخوار اژدہا تھا جس کی جان لینا کارِ ثواب ہے۔

یہ فساد اتنی سرعت سے پھیلا اور بڑھا کہ پولیس بھی بے بس ہو گئی، حکومت کی مشینری معطل ہو گئی، فوج بلائی گئی، تب جا کر یہ انسان نما درندے اپنے اپنے بلوں میں دبکے۔

تنویر نے فساد کے دوران میں بڑی سرگرمی اور بہادری سے اپنے فرائض انجام دیے، اپنی جان خطرہ میں ڈال کر، زخمی ہو کر، اس نے مسلمان محلّوں سے ہندو باشندوں کو صحیح سلامت محفوظ علاقوں میں پہنچایا، وہ پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ سر ہتھیلی پر رکھ کر ہندو محلوں میں بھی پہنچا، اور مسلمانوں کو خطرہ کے علاقہ سے نکال لایا، لیکن تباہی اتنی عام اور فساد اتنا ہولناک تھا کہ، یہ ان تھک محنت بھی، شہر کو تباہی و بربادی سے نہ بچا سکی، سینکڑوں آدمی موت کے گھاٹ اُتر گئے، ہزاروں آدمی زخمی ہو کر سسکنے لگے، نہ جانے کتنے بچّوں کو یتیمی کا داغ اٹھانا پڑا، نہ جانے کتنی سہاگنوں کو بیوگی کا غم سہنا پڑا، نہ جانے کتنی ماؤں کے اکلوتے بچے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے، نہ جانے کتنے اپاہج، معذور، اندھے اور بے بس پالوں سے ان کے سہارے چھین لیے گئے۔

تنویر اس دہکتی، بھڑکتی اور جھلسا دینے والی آگ کو اپنے خون سے بجھا دینا چاہتا تھا، لیکن بے بس تھا، بہت کچھ کر چکنے کے بعد بھی وہ کچھ

نہ کر سکتا تھا، اس نے ایسے لرزہ خیز، جگر خراش اور ہولناک مناظر دیکھے تھے، جن کے تصوّر سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، اس نے وہ جوان عورتیں دیکھی تھیں، جن کی چھاتیاں کاٹ لی گئی تھیں، اس نے وہ معصوم بچے دیکھے تھے، جو خون میں لت پت، موت کے آغوش میں ہمیشگی کی نیند سو رہے تھے، اس نے وہ تنومند اور کڑیل جوان دیکھے تھے، جن کی گردن اس جرم میں کاٹی گئی تھی کہ وہ پاکستان یا اکھنڈ ہندوستان کے قائل تھے، فساد کے دوران میں گشت کرتے ہوئے اس نے ان ہندو سورماؤں کو دیکھا تھا، جنھوں نے اپنے مسلمان ہمسایوں کو، پیڑ دل چھڑک کر جلا کر مارا تھا، اس نے ان مسلمان مجاہدوں کو دیکھا تھا، جنھوں نے بے گناہ ہندو راہ گیر کی گردن کند چھری سے کاٹی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا، انسانیت روپوش ہو گئی ہے اور درندگی، بہیمت اور سفّاکی کا راج چھا گیا ہے، ہر چہار طرف یہ دیکھ دیکھ کر، وہ سوچنے لگتا تھا کہ یہ دیس آزاد ہونے کا مستحق بھی ہے یا نہیں؟ جہاں سیاسی اختلافات کا تصفیہ اتنے وحشیانہ طریقہ پر کرنے کی کوشش کی جاتی ہو، وہ ملک اگر آزاد بھی ہو جائے، تو کیا وہ اپنی آزادی قائم رکھ سکے گا؟ اس کے ایک ہندو ساتھی نے دُکھے ہوئے دل کے ساتھ بتایا کہ چند مسلمان مچھیرے جو ایک ہندو آبادی میں پھنس گئے تھے، اپنا مذہب ترک کر کے ہندو ہونے پر تیار تھے، پھر بھی ان میں سے ایک ایک کو ہلاک کر دیا گیا، اس نے اپنے ایک مسلمان ساتھی کی

لرزتی ہوئی زبان سے سُنا کہ چند ہندو، راہ گیر کلمہ پڑھنے کے باوجود نہ بخشے گئے، اور بالآخران میں سے ایک ایک کا خاتمہ کر دیا گیا۔

یہ سب کچھ دیکھ کر، یہ سب کچھ سن کر، کبھی وہ رونے لگتا تھا، کبھی خاموش ہو جاتا تھا، روتا تھا، اہل وطن کی نادانی پر، سوچتا تھا اپنے غیر ترقی یافتہ اور غیر متمدن ملک کے انجام کو، جس میں ہندو اور مسلمان، صدیوں سے مل جل کے رہتے تھے، آج وہی ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، ایک دوسرے کی جان لینا کارِ ثواب سمجھتے تھے، وہ خود پاکستان کا سخت مخالف تھا، لیکن مخالفوں کے قتل کو جائز نہیں سمجھتا تھا، وہ اکھنڈ ہندوستان کا دل و جان سے قائل تھا، لیکن مخالفت کا خاتمہ زور بازو سے کیا جائے، اس کا بھی قائل نہیں تھا۔

کئی روز کی دوڑ دھوپ کے بعد فوج نے امن قائم کیا، اور حالات کسی حد تک ساز گار ہوئے، اب اسے پھر پٹنہ کی یاد آئی، پھر نزہت کی بھولی بھالی، معصوم، اور شوخ تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی اب کالکتہ میں ٹھہرنا بے سود تھا۔ اسے ایک ایسے امن کی تلاش تھی جہاں وہ اپنے زخمی دل پر مرہم رکھ سکے، جہاں اپنی لٹی ہوئی عافیت کو پھر سے حاصل کر سکے، جہاں وہ، ہنگامہ اور شورش سے الگ رہ کر، سکون اور خاموشی کے ساتھ اپنے اجڑے ہوئے دل کا مداوا کر سکے، ظاہر ہے اس کام کے لیے نزہت کے نشیمن سے بڑھ کر اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔

اس عرصہ میں وہ نزہت کو، کوئی خط بھی نہیں لکھ سکا تھا، اپنا پتہ بھی نہیں بتا آیا تھا، اس لیے نزہت بھی، اسے خط نہیں لکھ سکی تھی، چلتے وقت خیال آیا، روانگی کا تار دے دے، پھر سوچا اچانک پہنچنے میں جو لطف ہے وہ اطلاع دے کر جانے میں نہیں۔

پیار کی باتیں

تنویر پٹنہ پہنچا، ایسا معلوم ہُوا، جنت میں پہنچ گیا، ساری ماندگی اور کُلفت، نزہت کو ایک نظر دیکھ لینے سے دور ہو گئی، کچھ دیر تک وہ افتخار چچا سے باتیں کرتا رہا، پھر چچی سے باتیں کیں، اور وہاں سے سیدھا نزہت کے کمرہ میں پہنچا، وہ اس وقت دھانی رنگ کا دوپٹہ اوڑھے اور اسی رنگ کی شلوار اور قمیض پہنے، اپنے کمرہ کے دروازہ میں کھڑی تھی، تنویر کو آتا دیکھ کر اندر چلی آئی اور وہ بھی ساتھ ساتھ پہنچا۔

"مزاج شریف!" تنویر نے متبسّم ہو کر نزہت سے کہا۔

"دعا ہے آپ کی!" نزہت نے تیوریاں چڑھا کر جواب دیا۔

"خیریت؟ یہ تیوریاں کیوں چڑھی ہوئی ہیں سرکار؟ مجھ نیازمند کے سر پر قضا منڈلا رہی ہے؟ آخر ماجرا کیا ہے؟ ہُوا کیا ہے؟" تنویر نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا،

نزہت ہنسنے لگی، اس نے دوپٹہ کو قرینہ سے سر پر ڈالتے ہوئے کہا،

"ایکٹنگ کی مشق آپ نے کہاں کی؟"

"حقیقت میں تصنع کا رنگ دیکھتی ہو، ظلم کرتی ہو بخدا، اس دل پر، جو محبت کے سوا کچھ نہیں جانتا!"

"ہر بات کی تان آپ محبت پر کیوں توڑتے ہیں واہ!"

"مجبور ہوں، بندۂ محبت جو ہوں!"

"کہیئے کلکتہ میں عید تو خوب گذاری ہوگی؟"

"عید؟ ہماری عید تو آج ہے، اور ایک دن کی نہیں، جب تک یہاں رہیں گے عید ہی رہے گی، آنکھوں کی عید یہ ہے کہ تمھیں دیکھیں دل کی عید یہ ہے کہ اپنی دھڑکن تمھیں سنائے ۔"

"توبہ ہے، یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، میں نہیں ماننے کی، آپ نے کلکتہ میں سوا تھیٹر اور سینما دیکھنے کے کچھ نہیں کیا ہے!"

"یہ نہ کہو نزہت!"

"کیوں؟ وجہ؟"

"جو دل کے ہاتھوں خود تماشہ بن چکا ہو، وہ دوسروں کا تماشہ کیا دیکھے گا!"

"پھر وہی دل! ——————— میں کہتی ہوں کچھ اور باتیں بھی آپ کو آتی ہیں یا نہیں؟"

"ہر وہ بات آتی ہے جو تم پسند کرو، جس سے تمھاری طبیعت خوش ہو۔ تمھارے لیے مطرب، ندیم، قصہ خواں سب کچھ بن سکتا ہوں۔"

"اب ہو چکی اداکاری، کلکتہ کے حالات سنائیے، میں تو اخبارات

میں خبریں پڑھ پڑھ کر کانپ جاتی تھی، فوراً آپ کا خیال آتا تھا، نہ جانے آپ کہاں ہوں، کیا کر رہے ہوں، خدانخواستہ کسی مصیبت میں نہ پھنس گئے ہوں، بعض دفعہ نہ جانے کیوں رونا آجاتا تھا، اور کمرہ میں اکیلی بیٹھ کر پہروں رویا کرتی تھی، یا پھر خدا سے دعا کرتی تھی، آپ صحیح سلامت واپس آئیں ——— ہمارا تو یہ حال تھا، اور آپ اتنے بے مروت کہ ایک خط بھی نہیں لکھا، نہ پتہ دے گئے، پھر دعویٰ ہے محبت کا، بات پیچھے کریں گے، دل کی دہائی پہلے دیں گے، جائیے بس دیکھ لیا، آپ کو، آپ کے دل کو، آپ کی محبت کو!"

"ایک سانس میں تم کتنی ساری باتیں کہہ گئیں نزہت!"

"جھوٹ ہو تو بتائیے!"

"تمہیں جھوٹا کون کہہ سکتا ہے؟"

"پھر قائل ہو جائیے، مان لیجئے اپنی غلطی!"

"غلطی بھی مان لوں گا، لیکن نزہت تم میری محبت پر الزام نہ دھرو!"

یہ الفاظ تنویر نے کچھ ایسے تاثر کے عالم میں کہے کہ نزہت کا دل پسیج گیا، اس نے کہا،

"اچھا میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں، اب تو خوش ہوئے آپ؟"

"تم سے ناخوش ہو کر زندہ رہ سکتا ہوں بھلا؟"

"جینے مرنے کا حوالہ نہ دیجئے، یہ باتیں ہمیں ذرا بھی اچھی نہیں لگتیں!"

"نزہت! ——— میں کلکتہ میں تھا، لیکن میرا دل تمہارے

پاس تھا، میری روح تمھارے قدموں میں تھی!"

"اے ہے خدا نہ کرے!"

تنویر نے بے خودی کے عالم میں سلسلۂ کلام جاری رکھا،

"میں موت سے کشتی لڑ رہا تھا، موت کے دہانہ میں پہنچ چکا تھا، مجھ پر تیزاب پھینکا گیا، میری موٹر پر حملہ ہوا، اور وہ چور چور ہو گئی۔ میری قیام گاہ پر غنڈے چڑھ آئے اور چمکتا ہوا چاقو نکال کر، انھوں نے اعلان جنگ کر دیا، لیکن سخت جان تھا، بچ گیا، صرف معمولی سے جراحت پہنچی۔"

نزہت سہمے ہوئے انداز میں تنویر کی باتیں سن رہی تھی، اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر اپنے محبوب و مطلوب کے بچ جانے پر ادا کیا، پھر پوچھا،

"لیکن یہ لوگ آپ کے پیچھے کیوں پڑ گئے تھے؟"

"اس لیے کہ میں درندہ نہیں تھا!"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ میں مسلمانوں کے پنجہ سے ہندوؤں کو بچاتا تھا، ہندوؤں کی گرفت سے مسلمانوں کو چھڑاتا تھا، ہندو، اس لیے تیزاب پھینکتے، اور موٹر روک کر حملہ کرتے تھے کہ میں مسلمان تھا اور مسلمان اس لیے کہ چاقو دکھاتے اور لاٹھی چلاتے تھے کہ میں کانگرسی تھا، یہ کسی نے نہ سمجھا کہ میں مسلمان ہونے کے باوجود ہندوؤں کا، اور کانگرسی ہونے کے باوجود

مسلمانوں کا دشمن نہیں ہوں۔"

"یا اللہ ——— کیا ہو گیا ہے، آخر ان کلکتہ والوں کو؟"

"درندگی سوار ہے، چاہتے ہیں ہر شخص درندہ ہو جائے، اور جو درندہ بننے سے انکار کرتا ہے، اس کی پیٹھ میں یہ چاقو بھونک دیتے ہیں، اس کا چہرہ یہ تیزاب پھینک کر بگاڑ دیتے ہیں۔"

"آخر یہ فساد ہوا کیوں؟"

"درندے کسی وجہ اور سبب کے ماتحت کبھی نہیں لڑا کرتے!"

"پھر بھی! ——— اچھا یہ بتائیے پہل کس کی طرف سے ہوئی تھی!"

"کسی کی طرف سے نہیں!"

"اے واہ، تو آپی آپ جھگڑا شروع ہو گیا؟"

"میرا مطلب ہے دونوں کی طرف سے، دونوں فریق لڑنے مرنے پر تیار تھے، گتھ گئے آپس میں! ———"

نزہت نے تکیہ اٹھا کر زانو پر رکھتے ہوئے کہا،

"آپ فرشتہ بن کر، دونوں طرف کی میزان برابر رکھیے ہیں تو کبھی نہیں مانوں گی، مسلمانوں نے جنگ چھیڑی۔"

"میں نے کب کہا کہ مانو!"

نزہت نے گویا یہ جملہ سنا ہی نہیں، وہ اپنی رَو میں کہے جا رہی تھی،

"اوّل تو اس لیے کہ مسلمان، اگر فساد کرنا چاہتے تو وہاں کرتے جہاں

ان کی اکثریت ہوتی، کلکتہ میں تو وہ ۲۶ فی صدی ہیں، دوسرے مجھے مہرودی صاحب کا بیان یاد ہے جس میں انھوں نے کہا تھا، ہسپتال جھوٹ نہیں بول سکتے، وہاں کے ریکارڈ سے ثبوت حاصل کیا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلے مجروحین و مقتولین کی کھیپ کس قوم کی وہاں پہنچی تھی!"

تنویر مسکرایا، اس نے کہا،

ماشاء اللہ، دلیل، ثبوت، ہر حربہ سے آپ مسلح ہیں —— میں نہیں جانتا تھا، تم اتنی کٹر فرقہ پرست ہو!"

"اوہو، اور آپ؟"

"میں؟"

"جی آپ! آپ کیا ہیں؟"

"نزہت پرست! —— میں تو تمھارا پجاری ہوں!"

"توبہ کیجئے، کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ!"

"کچھ جھوٹ تو نہیں کہہ رہا ہوں؟ کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست!"

"اچھا یہ بتائیے، آپ نے اس طوفان میں مسلمانوں کی خدمت بھی کچھ کی؟"

"نہیں!"

وہ بپھر کر بولی،

"کیوں؟"

"میں وہاں انسانوں کی خدمت کر رہا تھا، ان میں ہندو بھی تھے،

اور مسلمان بھی! تمھارے علامہ اقبالؒ میرے ہی لیے کہہ گئے ہیں،

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں
بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو
خدا کے بندوں سے پیار ہوگا!

خدا کے بندوں کی سیوا کر رہا تھا!"

"خیر یہ تو اچھا کیا آپ نے، لیکن سنا ہے کلکتہ کے مسلمان اس وقت بڑی بپتا میں ہیں، پولیس انھیں بہت پریشان کر رہی ہے، نقصان بھی انھوں نے اٹھایا، اب مصیبت میں بھی وہی پھنس رہے ہیں!"

"ہاں، یہ تم نے ٹھیک سنا ہے، اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو مجھے اندیشہ ہے یہ آگ کلکتہ سے بڑھتے بڑھتے سارے بنگال میں پھیل جائے گی؟"

نزہت نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا،

"خدا رحم کرے بیچارے مسلمانوں پر، ہر طرف سے ان کے لیے مصیبت ہی مصیبت ہے!"

"ہاں! لیکن خود ان کی لائی ہوئی!"

"یہ کیسے؟"

"خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے پاکستان کا شگوفہ چھوڑ دیا، پاکستان نہ ملا، نہ ملے گا، لیکن آپس کے تعلقات میں زہر پیدا ہو گیا، میں اسے تدبّر نہیں حماقت کہتا ہوں!"

نزہت نے پھر تیوری پر بل ڈال لیے اور کہا،

"آپ جو چاہیں کہیں، آپ کی زبان کوئی نہیں پکڑ سکتا، لیکن آپ جیسے تعلیم یافتہ اور سمجھ دار آدمی کی زبان سے جب ایسی لچر، اور بودی باتیں سنتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے!"

"لچر اور بودی باتیں؟"

"ہاں اور کیا؟"

"کس طرح؟"

"ایک قوم اگر اپنی آزادی کا مطالبہ کرے، تو اس کی سزا یہ ہے کہ کچل دی جائے؟ اُسے دشمن سمجھ لیا جائے؟ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے؟ آپ شوق سے پاکستان کی مخالفت کیجئے، میں اعتراض نہیں کرتی، لیکن مخالفت کی بنیاد دلائل پر رکھئے، جذبات پر نہ رکھئے!"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ احتشام آیا،

اس نے کہا،

"کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے، ابا جان آپ کا انتظار کر رہے ہیں!"

"ارے ـــــ چلو بھئی چلیں! بھوک بھی بڑے زور کی لگی ہے!"

ماتم

ایک روز تنویر اور نزہت حسب معمول صبح کی چائے ساتھ ساتھ بیٹھے پی رہے تھے، کہ عبدل نے "پٹنہ ٹائمز" کا تازہ پرچہ لاکر سامنے رکھ دیا، اخبار کے پہلے صفحہ پر نظر ڈالتے ہی تنویر نے کہا،

"ارے!"

اور چائے چھوڑ کر، بڑے انہماک اور استغراق سے اخبار پڑھنے لگا،

اخبار پڑھ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی، اور چائے کی پیالی پرے رکھ دی

نزہت نے پوچھا،

"کیا ہوا چائے کیوں چھوڑ دی آپ نے؟"

"جی نہیں چاہتا نزہت!"

"آخر کیوں؟"

"چائے کے بجائے خونِ جگر پی رہا ہوں، یہی کافی ہے!"

"آپ تو پہیلی بجھانے لگے، صاف صاف کہیئے گا کیا بات ہے؟"

تنویر نے اخبار نزہت کی طرف بڑھا دیا،

"تم خود پڑھ لو!"

نزہت اخبار پڑھ رہی تھی اور دم بدم اس کے چہرہ کا رنگ اُڑتا جا رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی نے سفیدی پھیر دی ہے، معلوم ہوتا تھا کوئی بڑی دہشت انگیز اور پریشان کن خبر ہے، نزہت نے اخبار الگ رکھ دیا، اور چائے کی ٹرے دور ہٹا دی، اس کے چہرے پر اس وقت غم والم کی عجیب کیفیت طاری تھی، دونوں خاموش تھے، لیکن یہ خاموشی دردِ نہاں کا راز افشا کر رہی تھی، دونوں میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہے؟ گفتگو کا سلسلہ چھیڑے تو کیوں کر؟

اسی خاموشی اور محویت کے عالم میں احتشام آگیا، اس کے ہاتھ میں بھی "پٹنہ ٹائمز" تھا اور اس کے چہرہ پر بھی صدمہ اور پریشانی کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، اس نے نزہت سے کہا۔

"بینی آباد کی خبر پڑھی؟"

"پڑھ لی!"

"سمجھ میں نہیں آتا یہ کیا ہو رہا ہے؟"

نزہت نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھ کے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"فساد کی آگ وہاں کیسے بھڑک اٹھی؟"

"کیا معلوم!"

"میں اکرام خالو کے بارے میں بہت پریشان ہوں، خدا جانے ان کا کیا حشر ہوا؟ ——— امی کو یہ خبر تو آپ نے نہیں سنائی؟"

"نہیں ——— تم سنانا، یہی کہنے آیا تھا، ورنہ وہ روتے روتے جل تھل کر دیں گی، اور کسی کے سنبھالے نہیں سنبھلیں گی!"

"——— لیکن کچھ خبر تو منگوائیے!"

"آدمی بھیجا ہے! ——— ابا جان بھی سخت پریشان ہیں!"

احتشام نے نظر اٹھائی تو دیکھا نزہت کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں، اس نے تسلّی دیتے ہوئے کہا،

"پریشان کیوں ہوتی ہو، اکرام خالو، تو انشاء اللہ بہر حال بخیریت ہونگے!"

"یہ آپ نے کیسے جانا؟"

"وہاں کے پرانے قومی کارکن ہیں، ساری عمر کانگرس کی خدمت میں گذار دی ہے، انھیں کون ہاتھ لگا سکتا ہے؟"

ان باتوں سے نزہت کو کچھ تسلی ہوئی، احتشام کے جانے کے بعد، تنویر بھی اُٹھ کھڑا ہوا، مجلس اب بے کیف و بے مزہ ہو چکی تھی، جاتے جاتے اس نے کہا،

"میں ذرا پروفیسر عبدالباری کے پاس جا رہا ہوں!"

"کب آئیے گا؟"

"یہی گھنٹہ دو گھنٹہ میں!"

تنویر کے جانے کے بعد، نزہت ایک پریشانی اور اضطراب کے عالم میں، کمرہ کے اندر ٹہلنے لگی، اُسے اپنے اکرام خالو سے بڑی محبت تھی، لیکن ان سے زیادہ وہ ان کی لڑکی زلیخا کو چاہتی تھی، جو احتشام کی منگیتر

تھی، حسن صورت اور حسن سیرت کا دل آویز مجموعہ، اس کی ہرنی سی بڑی بڑی آنکھیں، نزہت کو بہت پسند تھیں، وہ جب زلیخا سے ملتی، اس کی آنکھوں کو "نظر لگائے" بغیر نہ رہتی۔

تنویر پروفیسر عبدالباری، صدر صوبہ کانگرس کمیٹی کے پاس پہنچا، وہ بڑے اخلاق و تپاک سے پیش آئے، کلکتہ میں اس نے جو کارنامے انجام دیے تھے، جی کھول کر ان کی داد دی، اور آزاد ہند فوج کے مستقبل پر گفتگو کرتے رہے، ان کا خیال تھا، آزاد ہندوستان، آزاد ہند فوج کے سورماؤں اور ساونتوں کو سر آنکھوں پر بٹھائے گا، اپنے اس خیال پر انھیں بہت اصرار تھا کہ ہندوستان کا آئندہ کمانڈر انچیف میجر جنرل شاہنواز کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

انہی باتوں میں دو بج گئے، تنویر نے گھڑی دیکھ کر کہا،

"افوہ، بہت دیر ہو گئی، اب اجازت دیجیے، پھر کبھی حاضر ہوں گا!"

پروفیسر نے شفقت اور محبت کے لہجہ میں کہا،

"دو بج چکے ہیں، اب کہاں جاؤ گے، کھانا تو کھا لو!"

تنویر نے ادب کے ساتھ جواب دیا،

"ضرور کھا لیتا، لیکن گھر پر انتظار ہو رہا ہوگا!"

پروفیسر صاحب سے رخصت ہو کر، تنویر گھر پہنچا، تو عجیب منظر دیکھا، ایک کہرام برپا تھا، جیسے دیکھو اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں، انتشار دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا، احتشام روتے روتے نیم بے ہوش

ہو گیا تھا، افتخار صاحب باہمہ وقار و دبدبہ، رومال پر رومال آنسوؤں سے تر کر رہے تھے، نزہت کا رونا تو دیکھا نہیں جاتا تھا، اور چچی پچھاڑیں مار کر رو رہی تھیں، یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ یہی سوچتا ہوا تنویر گھر میں داخل ہوا، عبدل کو الگ لے جا کر کیفیت پوچھی، تو اس نے ہاتھ سے ناک اور کہنی سے آنسو پونچھتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا،

"غضب ہو گیا صاحب!"

"کیا ہوا، کچھ کہو تو!"

"بینی آباد میں ——— یہ کہتے کہتے وہ پھر رونے لگا،

روتے روتے اس نے کہا،

"اکرام میاں مار ڈالے گئے!"

"ایں؟"

"ہاں سرکار!"

عبدل پھر رونے لگا، اندر پہنچ کر تنویر نے نزہت کے پاس ایک نئی صورت دیکھی، ہرنی کی سی بڑی بڑی آنکھیں سے آنسوؤں کا دریا رواں تھا، بے بسی اور بے کسی کے ساتھ اس کا رونا، چچی کا اسے گلے لگانا، نزہت کا اس کے ساتھ جوش گریہ سے مجبور ہو جانا، یہ ایسا منظر تھا جس نے تنویر جیسے بہادر کے بھی رونگٹے کھڑے کر دیے،

تنویر کو حیرت ہو رہی تھی، اکرام میاں کیسے مار ڈالے گئے؟ ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، لیکن جو کچھ سنا تھا، اس سے تو یہی معلوم

ہوتا تھا کہ وہ بڑے با اثر اور ہر دلعزیز مقامی لیڈر تھے، لیکن یہ موقعہ زیادہ پوچھ گچھ کرنے کا نہیں تھا، وہ خاموشی سے باہر آگیا، اور چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

شام تک افتخار میاں کے ہاں ماتم گساروں اور ہمدردوں کا تانتا لگ گیا۔ تعزیت اور تلقین صبر کے لیے جو لوگ آئے، ان میں پروفیسر عبدالباری بھی تھے، انھوں نے افتخار سے پوچھا،

"حادثہ کی تفصیل بھی معلوم ہوئی؟"

"جی ہاں معلوم ہوئی، لیکن میری زبان یار انہیں دیتی کہ بیان کرسکوں، انعام کو بلواتا ہوں، اس سے پوچھ لیجئے سب کچھ!"

فوراً انعام آیا، ۲۰، ۲۲ سال کا ایک خوب صورت نوجوان، پروفیسر صاحب نے محبت بھرے لہجہ میں اس سے کہا،

"آؤ بیٹا، میرے پاس بیٹھ جاؤ!"

وہ ادب سے ان کے پاس آکر بیٹھ گیا، انھوں نے پوچھا،

"کیوں بیٹا، یہ حادثہ کس طرح ہوا؟ اکرام میاں تو بڑے پکے کانگرسی تھے، انھیں لوگوں نے کیسے قتل کردیا؟"

انعام نے آنسوؤں کو روکتے ہوئے، اور آواز کو سنبھالتے ہوئے کہا،

"بینی آباد میں، ایک آبا ہی نہیں، تقریباً سب ہی کانگرسی تھے، وہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، وہاں کے مسلمان تعلیم یافتہ بھی ہیں اور فرقہ وارانہ

جذبات سے الگ بھی!"

"ہاں بیٹا میں جانتا ہوں ـــــ پھر؟"

"کلکتہ سے قصبہ کے دو نوجوان چھٹی میں وہاں آئے، ان کے ساتھ، ان کی بنگالن بیویاں تھیں، مقامی ہندوؤں کو شبہ ہوا کہ یہ اغوا کی گئی ہیں، اور انھیں زبردستی مسلمان کیا گیا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ!"

"انھوں نے مطالبہ کیا کہ یہ عورتیں ہمیں واپس دے دی جائیں، ورنہ ہم مار ڈالیں گے!"

نوجوان نے جواب دیا، یہ عورتیں مسلمان ہو چکی ہیں، ان سے ہم باقاعدہ شادی کر چکے ہیں، اور یہ شادی اور قبول اسلام کا معاملہ فساد سے بہت پہلے ہو چکا ہے، خود عورتوں نے بھی یہی بیان دیا، لیکن قصبہ کے ہندوؤں کی تشفی نہ ہوئی، اور وہ آمادۂ فساد ہو گئے، حالانکہ وہ لوگ مع اپنی بیویوں کے کلکتہ واپس جا چکے تھے!"

"پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی؟"

"ہم لوگوں نے تو نہیں بعض مسلم لیگیوں نے دی تھی!"

"پھر کیا ہوا؟"

"پولیس کی تھوڑی جمعیت آ بھی گئی، لیکن بینی آباد کانگرس کمیٹی کے صدر حافظ محمد شفیع صاحب نے اسے واپس کر دیا اور کہا، مسلم لیگیوں کا خدشہ بے بنیاد ہے، ہم پرکھوں کے وقت سے میل ملت کے ساتھ یہاں رہتے

چلے آئے ہیں، نہ کبھی فساد ہوا، نہ دنگا ہوا، یہاں فساد ہرگز نہیں ہو سکتا، بلکہ اگر پولیس یہاں ٹھہری تو ضرور اشتعال پیدا ہوگا!"

"پھر؟"

"اباجان نے بھی، حافظ صاحب کی رائے کی تائید کی اور پولیس چلی گئی!"

"چلی گئی؟"

"جی ہاں!"

"آگے . . . . پھر؟"

دوسرے دن قصبہ کے ہندوؤں نے گہار مچادی، اور ہلہ بول دیا، آس پاس کے مواضعات سے بھی ایک بہت بڑا گروہ آ گیا تھا، حافظ صاحب، ان کے والد، اور حافظ صاحب کے صاحبزادے اور اباجان نے، بپھرے ہوئے مجمع کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن اس نے انہی لوگوں پر حملہ کر دیا، سب سے پہلے ہلہ میں جو لوگ مجمع کے ہاتھوں قتل ہوئے وہ اباجان، اور حافظ صاحب تھے، پھر لوگوں نے حافظ صاحب کے لڑکے اور والد صاحب کو بھی بڑی بے دردی سے قتل کر دیا!"

پروفیسر عبدالباری نے حیرت کے ساتھ پوچھا،

"حافظ شفیع صاحب بھی قتل کر ڈالے گئے؟"

"جی ——— قتل کرنے کے بعد، لوگوں نے ہمارے گھروں میں آگ لگا دی، سامان لوٹ لیا، جو سامنے آیا وہ مارا گیا، جو بھاگا، اس کا پیچھا کیا اور ہلاک کر کے دم لیا، بچے بھی قتل ہوئے، عورتیں بھی ہلاک کی گئیں!"

"بچے بھی؟ عورتیں بھی؟"

"جی بچے بھی، عورتیں بھی، بوڑھے بھی، بیمار بھی ـــــ ہمارا گھر بھی لوٹ کر جلا دیا گیا، اب وہ کھنڈر ہے، صرف ہمارے ہی گھر پہ کیا ہے قصبہ کے تقریباً سارے مسلمانوں کے گھر لوٹے، اور نذرِ آتش کیے جا چکے ہیں، تقریباً سارے مسلمان، ہلاک اور قتل کیے جا چکے ہیں، صرف وہ زندہ ہیں، جو کسی طرح بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ـــــ والد کی نماز جنازہ اور تجہیز و تکفین بھی نہ ہو سکی، اب تک ان کی لاش چوراہے پر پڑی ہو گی اور اسے چیل کوّے نوچ نوچ کر کھا رہے ہوں گے!"

یہ کہتے کہتے انعام بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، افتخار میاں اور پروفیسر عبدالباری کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے، انھوں نے اسے گلے لگا لیا اور کہا،

"بیٹا، روؤ مت، اکرام میاں شہید ہوئے ہیں، تم اطمینان رکھو، ملزم ضرور کیفر کردار کو پہنچیں گے، میں پریمر سنہا سے ابھی جا کر ملتا ہوں!"

اُٹھتے اُٹھتے پروفیسر صاحب نے انعام سے پوچھا،

"اب بینی آباد کا کوئی مسلمان زندہ نہیں ہے؟"

"بینی آباد میں جو مسلمان تھے، سب فنا کے گھاٹ اتر چکے، زندہ صرف وہ ہیں جو پہلے سے باہر تھے یا حالات کا اندازہ کر کے وقت سے کچھ پہلے قصبہ چھوڑ کر دوسری جگہ جا چکے تھے ـــــ وہ تو کہیئے کہ خیریت ہوئی کہ زلیخا وہاں

نہیں تھی، ورنہ وہ بھی ہلاک ہو جاتی!"

"کہاں تھی زلیخا؟"

"چند میل کے فاصلہ پر دوسرے قصبہ میں، ایک تقریب میں شرکت کے لیے گئی تھی!"

"تم کیسے بچ گئے؟"

"اسے بھی ایک اتفاق سمجھئے، والد میری آنکھوں کے سامنے قتل ہوئے، بے بسی کے ساتھ انھیں قتل ہوتا دیکھ کر میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اور میں تیورا کر گر پڑا، دو چار لاٹھیاں میرے بھی پڑیں، لیکن میں بے ہوش ہو چکا تھا، حملہ آور یہ سمجھے کہ مر گیا ہوں، پھر انھوں نے میری طرف توجہ نہ کی، دوسروں کا شکار کرتے رہے، رات کو بارہ بجے کے قریب لاشوں کے انبار میں پڑے پڑے مجھے ہوش آیا، سناٹا چھایا ہوا تھا، میں سب کچھ سمجھ گیا، اب مجھے زلیخا کا خیال تھا، گرتا پڑتا اٹھا اور بچتا بچاتا اس کے پاس پہنچ گیا، اور اسے لے کر یہاں آ گیا!"

انعام پھر رونے لگا، پروفیسر صاحب اپنے آنسو پونچھنے لگے۔

زلیخا

زلیخا اب یتیم تھی، کل باپ کی محبّت و شفقت اس کا سرمایۂ حیات تھی، وہ روٹھتی تھی، باپ مناتا تھا، وہ ضدیں کرتی تھی، باپ پوری کرتا تھا، وہ فرمائشیں کرتی تھی، باپ تعمیل کرتا تھا، وہ انعام سے جھوٹ موٹ خفا ہو کر شکایت کرتی تھی، باپ بغیر تفتیش کیے اسے ڈانٹنے لگتا تھا وہ جو چاہتی تھی، کھاتی تھی، جو چاہتی تھی، پہنتی تھی، باپ کماتا تھا، وہ راج کرتی تھی، لیکن اب وہ سرمایۂ حیات لٹ چکا تھا، انسان کی صورت رکھنے والے درندوں نے ڈاکہ ڈال کر، اس کی خوشیاں چھین لی تھیں، اس کے بے گناہ باپ کو شہید کر دیا تھا، اب خدا کی اس وسیع دنیا میں وہ اکیلی تھی، دنیا کی رنگینیاں اب بھی وہی تھیں، دلچسپیوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، چہل پہل وہی تھی، لیکن زلیخا کی دنیا مٹ چکی تھی، اس کی زندگی کے چمن میں خزاں کا دور دورہ تھا، بہار لوٹی جا چکی تھی، محبت کرنے والا بھائی تھا، جان چھڑکنے والی خالہ تھیں، زندگی کے سفر کا راہی اور رہنما احتشام تھا، ہر ہر بات کا خیال رکھنے والی سہیلی اور بہن نزہت تھی، لیکن اس محبت کرنے والے

مجمع میں بھی وہ تنہا تھی، اکرام کے ساتھ اس کی ہنسی، خوشی، اُمنگ ہر چیز کا خاتمہ ہو گیا تھا، یہ محبت کرنے والے لوگ اس کی یتیمی پر ترس کھاتے تھے اور مرنے والا باپ، اُس سے غیر مشروط محبت کرتا تھا، ترس اور محبت کے فرق کو زلیخا سمجھتی تھی، یہی وجہ تھی کہ اتنی خاطر داریوں کے بعد بھی اس کے دل کی کلی مرجھائی ہوئی رہتی تھی، وہ ہنستی تھی، لیکن اس کی ہنسی ماتم دارانہ ہوتی تھی، وہ مسکراتی تھی، لیکن اس کا تبسم، سوگوارانہ ہوتا تھا۔ وہ باتیں کرتی تھی لیکن صاف معلوم ہوتا تھا اس کا دل رو رہا ہے، وہ سوچا کرتی تھی، یہ زندگی کیوں کر کٹے گی؟

احتشام، زلیخا کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا، وہ چھپ چھپ کر اس کے ساتھ رویا کرتا تھا، وہ کوشش کر کر کے اُسے ہنسایا کرتا تھا، وہ چاہتا تھا، زلیخا بندِ غم سے آزاد ہو جائے، وہ تتلی کی طرح، ڈالیوں اور پھولوں کی سیر کرے، وہ بلبل کی طرح چہکے، وہ کوئل کی طرح کوکے، وہ اسے تسلی دیتا تھا اس کی خاطر کرتا تھا، اس کے سامنے زندگی کے خوش آیند خواب بیان کرتا تھا، اسے مشترک زندگی کی دل چسپ اور اُمنگ بھری اسکیموں میں شریک کرتا تھا، وہ ان سب باتوں میں حصّہ لیتی تھی، لیکن بے دلی سے، ایسا معلوم ہوتا تھا، دل مجھے چکا ہے، امنگیں مر چکی ہیں، ایک روز احتشام نے موقع پا کر پکڑا اور کہا،

"زلیخا، تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تم ہر وقت کیوں اُداس رہتی ہو؟"

اس نے ایک سوگوار تبسّم کے ساتھ کہا،

"نہیں تو!"

"تو کیا میں اندھا ہوں؟ تم اپنے آپ کو دھوکہ دے سکتی ہو، مجھے نہیں دے سکتیں!"

جواب نہ پاکر، احتشام نے نظر اٹھا کر دیکھا تو زلیخا کی بڑی بڑی آنکھوں سے ٹپ ٹپ، موتیوں کی بوندیں زمین پر گر رہی تھیں، احتشام کا لب و لہجہ بدل گیا، اس نے افسردہ اور غمگین لہجہ میں کہا،

"اس طرح تم زندہ نہیں رہ سکتیں زلیخا!"

"میرے لیے اب زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی ہے!"

"کیوں؟"

"نہ جانے کیوں!"

"دنیا میں سب کے باپ ہمیشہ زندہ نہیں رہتے، ایک نہ ایک دن انھیں مرنا ہی پڑے گا!"

"ٹھیک ہے، لیکن وہ اس بے دردی سے قتل نہیں کیے جاتے، صرف مرتے ہیں، ان کی بے گور و کفن لاشیں، گھنٹوں، زمین پر دھوپ میں پڑی سڑا نہیں کرتیں، انھیں خدمت، قربانی اور ایثار کا صلہ یہ نہیں دیا جاتا، کہ مار ڈالا جائے، ان کا گھر جلا دیا جائے، ان کا سامان لوٹ لیا جائے ——— میرے باپ کی خطا کیا تھی، صرف یہ کہ وہ کانگرس کا فدائی تھا، وہ اکھنڈ ہندوستان کا سپاہی تھا، لیکن اسے مسلمانوں نے مسلم لیگیوں نے نہیں مارا، اُسے ہندوؤں نے کانگرسیوں نے ہلاک کیا

میں ابّا سے اصرار کیا کرتی تھی کہ سفید داڑھی اچھی نہیں لگتی، خضاب لگایا کیجئے، وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتے تھے، ان ظالموں نے جب ان کے سر پر ڈنڈے مار مار کے ان کی سفید نورانی داڑھی کو، لال لال خون سے رنگا ہوگا، تو کیا حال ہوا ہوگا ان کا؟ کاش میں بھی ان کے ساتھ وہاں شہید ہو جاتی!۔۔۔"

زلیخا رونے لگی، روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں، احتشام نے تسلّی دیتے ہوئے کہا،

"سچ کہتی ہو زلیخا، یہ حادثہ بڑا دلدوز ہے، لیکن دنیا میں اس طرح کے حادثے بھی ہوتے رہتے ہیں، وہ اگر مسلم لیگ کے خلاف اور کانگرس کے موافق تھے، تو کسی لالچ کی وجہ سے نہیں تھے، ان کے ضمیر کا دیانتدارانہ فیصلہ یہی تھا، انھیں اسلام پر بھی ناز تھا اور اپنے وطن پر بھی، لیکن مسلمانوں نے اپنا دشمن سمجھا، اور ہندوؤں نے انھیں مار ڈالا، یہ ہلاکت نہیں شہادت ہے، موت تو ضرور آتی، آج نہیں کل، لیکن ایسی موت جو شہادت کی ہم پلہ ہو، صرف خوش قسمتوں ہی کے حصّہ میں آتی ہے، اسلام، ان کا نام اپنے شہیدوں کی فہرست میں لکھے گا، اور وطن انھیں اپنے جانثاروں کی صف میں جگہ دے گا، آج وطن کے لوگوں پر جنون اور درندگی طاری ہے، کل جب یہ انسان بنیں گے، تو اپنی حرکتوں پر پشیمان ہوں گے، ہم کانگرس میں اس لیے نہیں شریک ہیں کہ کانگرس ہمیں کوئی انعام اور صلہ دے، اس لیے شریک ہیں کہ ہماری وطن دوستی کا تقاضا یہی ہے، ہندو لاکھ

ہمیں ماریں، نقصان پہنچائیں، برباد کریں، بے آبرو کریں، لیکن ہم کانگرس کو نہیں چھوڑ سکتے، کانگرس جتنی ان کی ہے، ان سے زیادہ ہماری ہے، کانگرس کو ہم نے بنایا ہے، ہمارے محمد علی، شوکت علی نے —— ہندوؤں کی ضد میں ان کی مخالفت اور شرارت سے بد دل ہو کر، ہم کانگرس کو نہیں چھوڑ سکتے!"

کچھ دیر پہلے عابدہ اور نزہت بھی آگئی تھیں، اور خاموشی سے بیٹھی احتشام کی باتیں سن رہی تھیں، وہ جب اپنی کہہ چکا تو زلیخا اور نزہت تو خاموش رہیں، عابدہ پٹ سے بولی،

"اور کیا!"

"پھر، نزہت سے مخاطب ہوئی،

"اب فرمائیے کچھ!"

نزہت نے کہا،

"میں ان سے نہیں الجھتی، ان کا بس چلے تو افغانستان و ایران کو بھی کانگرسی بنالیں!"

زلیخا کے آنسو اب خشک ہو چکے تھے، احتشام کی دلیلوں اور باتوں سے کافی متاثر ہو چکی تھی اس نے کہا،

"بات تو ٹھیک ہے!"

عابدہ بولی،

"یہ تو ہم بھی جانتے ہیں، مگر (نزہت کی طرف اشارہ کرکے) اس

کافر کو مسلمان بناؤ تو جانیں ——— کیسی بھیگی بلّی بنی بیٹھی ہیں اس وقت، میرا، تنویر کا، ریحانہ کا تو بھیجا کھالیا ہے اس نے، جب دیکھو جب کانگرس کی مخالفت، اسے ضرور وظیفہ ملتا ہے مسلم لیگ سے!"

نزہت مسکرائی، اس نے کہا،

"آ گئیں خالص کانگرسی دلیلوں پر!"

احتشام نے ایک قہقہہ لگایا اور عابدہ سے کہا،

"معلوم ہوتا ہے بہت کافی بحث ہوتی رہتی ہے تم لوگوں میں!"

"بہت زیادہ، ہر وقت، جب دیکھو جب! ——— میں کہتی ہوں ہمارے خالص کانگرسی گھرانے میں یہ مسلم لیگی کہاں سے پیدا ہو گئی؟ ——— پسرِ نوح کہیں کی!"

احتشام نے "پسرِ نوح" کی پھبتی پر پھر ایک قہقہہ لگایا، نزہت نے عابدہ سے مخاطب ہو کر اور زلیخا کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا،

"آذر کے گھر ابراہیم کا پیدا ہونا، خدا کی پرانی سنت ہے، یہ کیوں نہیں کہتیں، غلط سلط باتیں کیوں کرتی ہو؟"

احتشام نے عابدہ سے ہنستے ہوئے کہا،

"مان لو بھئی! تم جھینپ گئیں، تمھارے جملہ کا بڑا استھرا جواب دیا ہے نزہت نے!"

عابدہ نے ذرا ہنستے ہوئے کہا،

"اچھی بات، آپ کہتے ہیں تو مانے لیتی ہوں، ورنہ ایسا جواب دیتی

کہ یاد کرتیں بی نزہت!"

نزہت نے کہا،

"خاطر سے ماننے کی سند نہیں، جواب دو اور جواب لو!"

عابدہ نے بحث سے پہلو بچاتے ہوئے کہا،

"اونھ تم سے مناظرہ کون کرے؟"

"کیا حرج ہے، آؤ، بولو، کہو!"

"بخشو بی بلائی، مرغی لنڈوری ہی اچھی!"

عابدہ جانے کے لیے اٹھی، زلیخا آج پہلی مرتبہ ہنسی، اس نے عابدہ کو بٹھاتے ہوئے کہا،

"چلی جانا، پہلے ایک بات بتائی جاؤ!"

عابدہ بیٹھ گئی،

"کہو!"

"یہ بخشو بی بلائی کا کون سا موقع تھا؟ بات کیا ہو رہی تھی اور جواب تم نے کیا دیا؟ ——"

"جیسے کو تیسا"، بڑا افلاطون سمجھتی ہیں اپنے آپ کو، دے لیں جواب میرے اس فقرہ کا تو جانوں؟"

نزہت نے کہا، "مرغی کی کاؤں کاؤں کا جواب ہی کیا!"

زلیخا اس جواب پر لوٹ پوٹ ہو گئی، احتشام مسکراتا ہوا باہر چلا گیا، زلیخا کو ہنستا اور مسکراتا دیکھ کر اس کے دل کا بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔

ایک اور حادثہ

تنویر مکان کے بالائی حصّہ میں مقیم تھا، ایک کمرہ اس کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا، وہ معمولاً رات کو دیر میں سوتا تھا اور دن چڑھے اٹھتا تھا، چائے کی پیالی اور صبح کا اخبار خادمہ بستر پر لا کر رکھ جاتی تھی، وہ کُلی کر کے بستر ہی پر بیٹھے بیٹھے چائے پیتا اور اخبار پڑھتا تھا، آج جب وہ آئی تو اخبار ندارد تھا، اس نے پوچھا،

"اور اخبار؟"

"آج نہیں آیا!"

"کیوں؟"

"مل ہی نہیں رہا ہے، جو ہاکر دے جاتا تھا، آج وہ بھی نہیں لایا، آدمی بازار گیا، تو وہاں بھی نہیں ملتا!"

"یہی تو پوچھتا ہوں، آخر کیوں؟"

"کہتا تھا، آج اخبار آٹھ آٹھ آنے کا بک رہا ہے، ہیں نہیں لایا!"

"یہ کس لیے؟"

"نہ جانے!"

"جا عبدل کو بُلا لا!"

عبدل آگیا، تنویر نے پوچھا،

"آج کا اخبار؟"

"سرکار آٹھ آٹھ آنے کا ایک پرچہ مل رہا ہے، کون لاتا؟"

"آٹھ آنے کا نہیں آٹھ روپے کا ملے، فوراً لاؤ جا کر!"

عبدل چلا گیا، اور تھوڑی دیر میں ہانپتا، کانپتا، اخبار لے کر آیا۔

"بارہ آنے میں ملا ہے بڑی مشکل سے!"

نہ اخبار کی ظاہری صورت میں فرق تھا، نہ ضخامت میں، تنویر نے حیرت کے ساتھ پوچھا،

"بارہ آنے میں؟"

"جی ہاں وہ بھی بڑی مشکل سے!"

عبدل چلا گیا، اور تنویر اخبار پڑھنے لگا، پہلے صفحہ پر نظر پڑی، تو جم کر رہ گئی،

"مشرقی بنگال میں ہندوؤں پر قیامت خیز مظالم"

"بے شمار انسان موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے"

"عورتوں کا جبری اغوا، عصمت دری، بچّوں کا قتل"

"پاکستان کی برکتوں کا ظہور شروع ہو گیا"

جلدی جلدی اس نے یہ سرخیاں پڑھیں، پھر نواکھالی اور ٹپرہ کی اصل خبریں

دیکھنا شروع کیں، ایک ایک سطر، لرزہ خیز، حوادث کی آئینہ دار تھی، اس نے پڑھا کہ :-

"مشرقی بنگال کے ہندوؤں پر قیامت ٹوٹ رہی ہے، وہ تباہی و بربادی کے ہلاکت خیز دور سے گذر رہے ہیں، ہزاروں مسلمان غنڈوں نے دفعتہً آس پاس کے ہندو دیہاتوں پر، حملہ کر دیا، مکانات جلا دیے، آدمیوں کو قتل کر دیا، جبراً انھیں مسلمان بنا لیا، عورتوں کو بھی بے دردی سے قتل کیا گیا، جو بچ رہیں انھیں زبردستی اسلام قبول کرنا پڑا اور زبردستی مسلمان نوجوانوں کے ساتھ ان کی شادی کر دی گئی، ان علاقوں کے ہندو بے تحاشا بھاگ رہے ہیں، لیکن انھیں پناہ نہیں ملتی، ان کا سامان برباد کر دیا گیا، ان کی دولت لوٹ لی گئی، مسٹر رائے ایک مقامی زمیندار نے، ان مجنونوں کا بہادری سے مقابلہ کیا اور دو روز تک مقابلہ جاری رکھا لیکن وہ تن تنہا کیا کر سکتے تھے؟ آخر یہ غنڈے ان پر غالب آئے، انھوں نے ان کے عالیشان مکانوں کو کھنڈر بنا دیا، ان کے معصوم بچوں کو قتل کر دیا اور ان کے گھر کی عورتوں کو ایک ایک کر کے ذبح کر دیا۔"

یہ خبر پڑھ کر غصہ سے تنویر کا چہرہ سرخ ہو گیا، وہ برہمی کے عالم میں کمرہ کے اندر ٹہل رہا تھا کہ شامت کی ماری نزہت آ گئی، اس نے تنویر کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا،

"چہل قدمی ہو رہی ہے اس وقت؟"

تنویر نے ٹہلنے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے انتہائی درشتی اور سختی کے ساتھ کہا،

"شرم شرم!"

نزہت کی سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے، اس نے کہا،

"خیریت؟ کیا ہوا؟"

وہ اس طرح بگڑ کر بولا، جیسے مشرقی بنگال کے حادثہ کی تمام ذمہ داری نزہت ہی پر ہے،

"ڈوب مرنے کا مقام ہے، یہ مسلمان ہیں؟ مجھے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے شرم آتی ہے! یہ اسلام ہے؟ اگر یہی اسلام ہے، تو میں ایسے اسلام سے بھی کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا ——"

نزہت نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا،

"آخر ہوا کیا؟ کچھ کہیئے تو؟"

"کاش میں مسلمان گھرانے میں نہ پیدا ہوتا!"

"آپ مسلمان گھرانے میں پیدا ہو کر بھی، اگر چاہیں تو اسلام ترک کر سکتے ہیں، مگر میں پوچھنا چاہتی ہوں بات کیا ہوئی؟"

"بات؟ حادثہ کہو! قیامت کہو!"

"قیامت سہی! مگر کچھ کہیئے بھی تو!"

تنویر نے اخبار نزہت کی طرف بڑھا دیا، اس نے جلدی جلدی ساری

خبریں پڑھیں، خبریں پڑھتے پڑھتے، دہشت اور صدمہ سے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا، اخبار الگ رکھتے ہوئے بولی،

"یہ واقعی قیامت کی خبر ہے!"

"قیامت سے بھی زیادہ!"

"بے شک! اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ بمبئی آباد کا بدلہ ہے، تو بھی یہ داغ مسلمانوں کے دامن سے نہیں دُھل سکتا، بدلہ لینا تھا، تو اتنا جتنا ظلم کیا گیا تھا، یہ بدلہ سے بہت زیادہ ہے، اور اسلام یہ کب تعلیم دیتا ہے کہ کرے کوئی، بھرے کوئی، جُرم کریں، بمبئی آباد کے ہندو، اور سزا ملے نواکھالی کے ہندوؤں کو، —— مجھے بھی بڑا دُکھ ہُوا، یہ خبر پڑھ کر۔"

"لیکن تمھارے قائدِ اعظم تو چین کی بنسری نیرو کی طرح بجا رہے ہیں! وہ بھی کچھ منہ سے پھوٹے!"

"جو بات جہاں تک ہے، اُسے وہیں تک رکھیے، قائدِ اعظم کا ذکر آپ بیچ میں کیوں لے آئے، اگر میں یہ پوچھوں کہ گاندھی جی نے بمبئی آباد کے حادثہ پر کیا کہا؟ کیا کیا؟ تو آپ کیا جواب دیں گے؟ —— لیکن میں پھر کہتی ہوں نواکھالی میں جو کچھ ہُوا، بہت بُرا ہُوا، مسلمانوں کو ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا!"

"لاحول ولا قوۃ —— یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود!"

نزہت خاموش بیٹھی رہی، تنویر جوش کے عالم میں ٹہلتا رہا، اس نے

نزہت سے مخاطب ہو کر کہا،

"حد ہے شقاوت کی!"

"مانتی ہوں، لیکن یہ خبریں سولہ آنے سچ ہیں یہ نہیں مانتی!"

تنویر نے بپھر کر پوچھا،

"کیا مطلب؟"

"ان خبروں میں مجھے مبالغہ بھی معلوم ہوتا ہے!"

"مبالغہ کیوں کہتی ہو، جھوٹ کہہ دو!" ——— "جھوٹ سہی!"

"کیوں؟"

"خبر رساں ایجنسیوں کے جھوٹ کو سب جانتے ہیں!"

"وجہ؟"

"ان کے کرتا دھرتا سب غیر مسلم ہیں، مسلمان کی کوئی بات ہو گی تو پہاڑ کو رائی دکھا دیں گے، یہ ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے!"

"ثبوت؟"

"بینی آباد ہی کو لے لیجئے، وہاں کچھ کم قیامت ٹوٹی تھی مسلمانوں پر، لیکن وہاں کی خبر کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی اور مشرقی بنگال کا افسانہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے۔"

"اسے افسانہ کہتی ہو نزہت؟"

"کیوں نہ کہوں؟"

"اتنی متعصب اور اتنی سنگدل ہو، یہ میں نہیں جانتا تھا۔"

"میں بالکل متعصب اور سنگدل نہیں ہوں!"

"ہوں!"

"بالکل نہیں ہوں!"

"ضرور!"

"ہرگز نہیں ہوں! ——— میرا دل نواکھالی کے مظلوموں پر کڑھ رہا ہے میں وہاں ہوتی تو ان کی مدد کرتی!"

"قتل ہونے میں؟"

نزہت نے تیوریاں چڑھا کر کہا،

"یہ آپ کیسی جلی کٹی باتیں کر رہے ہیں آج!"

"میرا دل جلا ہوا ہے!"

"کس سے؟"

"مسلم لیگ سے، مسلمانوں سے!"

اگر مسلمانوں کو اور مسلم لیگ کو اتنی صلواتیں سنانے کے بعد بھی جی ٹھنڈا نہیں ہوا ہے تو اور سنا لیجئے، لیکن میں نے کیا کیا ہے؟"

"تم بھی مسلمان ہو، ہم بھی تو مسلم لیگی ہو!"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے، آپ مسلم لیگی نہ سہی مسلمان تو ہیں؟"

"میں کچھ نہیں ہوں، صرف ہندوستانی ہوں، اور اس پر مجھے فخر ہے!"

"میں ہندوستانی بھی ہوں اور مسلمان بھی ہوں اور دونوں پر مجھے فخر ہے!"

"بالکل جھوٹ!"

"کیا جھوٹ؟"

"مسلم لیگی مسلمان، ہندوستان کی ناخلف اولاد ہیں!"

اب نزہت کو غصّہ آگیا، اس نے بگڑے ہوئے لب و لہجہ میں کہا،

"فقرہ ہے، اسلام کے ناخلف فرزند نہیں ہیں!"

"یہ تم مجھ پر چوٹ کر رہی ہو!"

"میں کسی پر چوٹ نہیں کرتی!"

"تمھیں سوچنا چاہیئے، تم کس سے مخاطب ہو، کس سے باتیں کر رہی ہو؟"

"میں جانتی ہوں، کیپٹن تنویر سے گفتگو کر رہی ہوں۔"

"میں اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہوں!"

"ہاں، لیکن خدا نہیں ہو اور میں جھوٹ خدا کے سامنے بھی نہیں بول سکتی!"

"گھنٹہ بھر سے اب تک تم کیا کر رہی ہو سوا جھوٹ بولنے کے!"

نزہت نے غصّہ کے عالم میں کہا،

"میں آپ کا یہ توہین آمیز رویّہ نہیں برداشت کر سکتی! ہوش کی باتیں کیجئے، حد سے آگے نہ بڑھیئے!"

تنویر چلّایا،

"نزہت!"

"سن رہی ہوں کہئے!"

"تم میری توہین کر رہی ہو!"

"اگر کی بھی تو اس وقت جب آپ میری توہین کر چکے تھے!"

"اگر میں تمھاری توہین کروں تو تم بھی میری توہین کرو گی؟"

"میں ہرگز اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتی!"

"میرے سوال کا جواب دو!"

"یہ اسی کا جواب ہے!"

"میں پوچھتا ہوں اگر میں تمھاری توہین کروں تو تم بھی میری توہین کرو گی؟"

"دو دفعہ ——— آپ ایک دفعہ توہین کریں گے، تو میں دو دفعہ کروں گی، سن لیجئے کان کھول کر!"

"کان تو کان میری آنکھیں بھی کھل گئیں!"

"شکر ہے، بہت جلد کھلیں!"

کچھ دیر تک خاموشی سی رہی، پھر تنویر نے کہا،

"یہ ہے مسلم لیگی تہذیب! اس طرح باتیں کی جاتی ہیں مردوں سے!"

نزہت نے سوال دہرا دیا۔

"یہ ہے کانگرسی تہذیب! اس طرح باتیں کی جاتی ہیں عورتوں سے!"

"تم بدتمیز بھی ہو اور بڑ زبان بھی!"

"خدا کا شکر ہے، یہ دونوں صفتیں مجھ میں نہیں ——— کسی اور ہی میں ہیں!"

"اور وہ "کسی اور" سوا میرے کون ہو سکتا ہے ؟"

"یہ آپ جانیئے!"

"اچھا ہُوا، تمھاری قدر و عافیت مجھے وقت سے پہلے معلوم ہو گئی!"

ان الفاظ کا مطلب سمجھ کر نزہت نے کہا،

"ہاں ٹھیک ہے، ابھی بڑھا ہُوا قدم پیچھے ہٹ سکتا ہے، ابھی گیا کیا ہے!"

"تم اس کے لیے بھی تیار ہو؟"

"اگر آپ تیار ہیں، تو مجھے ہرگز اپنے قدموں پر لوٹتا ہُوا نہیں پائیں گے میں ان عورتوں میں نہیں ہوں، جو ذلت اٹھا کر اور خود داری کو مجروح کر کے اپنا دل آباد کرتی ہیں!"

"مجھے مسرت ہے کہ اس صاف صاف گفتگو سے بہت جلد ہم ایک نتیجہ پر پہنچ گئے۔"

"کھری باتیں اور دو ٹوک فیصلہ مجھے بہت پسند ہے!"

"تو یہ فیصلہ تمھیں منظور ہے نا؟"

"جب آپ کو منظور ہے تو مجھے کیوں نامنظور ہو گا؟ ——— کیا آپ سمجھ رہے تھے میں آپ کی خوشامد کرنے لگوں گی، اور ہاتھ باندھ کر التجا کروں گی کہ اپنا فیصلہ بدل کر اس کنیز پر رحم فرمائیے ——— میں نزہت ہوں!"

"میں بھی تنویر ہوں!"

"مبارک ـــــ اچھا اب میں جاتی ہوں!"

"جاؤ، میں بھی سامان سفر باندھ کر ابھی رخصت ہو رہا ہوں!"

"جانے والے کو کون روک سکتا ہے!"

"جانے والا خود بھی نہیں رُکا کرتا!"

نزہت نے کوئی جواب نہیں دیا اور نیچے اتر آئی، اپنے کمرہ میں آکر وہ خوب جی بھر کے روئی، لیکن اس طرح کہ کسی اور کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے، وہ رو رہی تھی، اپنی توہین پر بھی، اور اس قلعہ کے منہدم ہونے پر بھی، جسے محبت کے سہارے برس ہا برس سے وہ تعمیر کرتی چلی آرہی تھی۔

تنویر کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا، بار بار سگریٹ جلاتا تھا، اور دو تین کش لگا کر پھینک دیتا تھا، وہ چاہتا تھا، نزہت اس کی کڑوی کسیلی باتیں سن کر بھی اسے منائے، لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی۔

تھوڑی دیر میں کسی کام سے عبدل آیا، تنویر نے اس سے سامان بندھوایا گھڑی دیکھ کر کہا، آدھ گھنٹہ کے اندر یہ سامان لے کر اسٹیشن پہنچ جائے، خود نیچے اُترا، پہلے چچی سے ملا، ان سے سفر کی اجازت طلب کی، وہ اس فوری فیصلہ پر حیران ہوئیں، لیکن اس نے انھیں مطمئن کر دیا،

"ابھی میں بنگال جا رہا ہوں، وہاں سے واپسی میں لاہور جاتے وقت یہاں سے ہوتا ہوا جاؤں گا۔"

وہ مطمئن بھی ہو گئیں اور راضی بھی، باہر پہنچ کر اس نے افتخار چچا کو بھی راضی کر لیا۔

"نواکھالی کے واقعات آپ نے پڑھے ہوں گے، میرا خون کھول رہا ہے، دل رو رہا ہے!"

"یہی حالت میری بھی ہے بیٹا، کیا ہو گیا وہاں کے مسلمانوں کو؟"

"جنون! میں نے فیصلہ کر لیا ہے، میں خود نواکھالی اور ٹپرہ وغیرہ کا دورہ کروں گا، اور حالات کا براہِ راست مشاہدہ کروں گا، کرپلانی جی کا ریڈیو پر بیان سن کر میں نے طے کر لیا ہے کہ فوراً جاؤں!"

"بڑا مبارک خیال ہے ضرور جاؤ، وہاں دکھی انسانیت کی خدمت کرو، مظلوم ہندوؤں کی مدد کرو اور ستم آرا مسلمانوں کو نادم کرو۔"

"انشاءاللہ یہی کروں گا ——— اچھا اب اجازت دیجئے، دقت ہو گیا ہے گاڑی کا!"

"ابھی جاؤ گے؟"

"جی نیک کام میں کیوں دیر کروں؟"

"ٹھیک ہے! جاؤ، خدا حافظ!"

تاثرات

جب عابدہ نے، نزہت کو تنویر کے رخصت ہونے کی خبر سُنائی تو اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، آنسوؤں کا طوفان اُمنڈ رہا تھا لیکن وہ اس طوفان کو دبائے ہوئے تھی، برس ہا برس کی محبّت، چاہ اور پیار کا انجام کیا نکلا؟ دُوری! جُدائی! تلخی! بدمزگی!

عورت کا دِل بڑا کمزور ہوتا ہے، وہ بہت جلد ہراساں ہو جاتی ہے وہ بہت جلد رونے لگتی ہے، وہ کسی قیمت پر بھی محبّت سے دستبردار ہونا نہیں چاہتی، یہ کیفیتیں نزہت پر بھی طاری ہوئیں، ان کیفیتوں نے نزہت پر غالب آنا چاہا، لیکن وہ نزہت تھی، عام عورت نہیں تھی، اس کے سینہ میں طوفان مچل رہے تھے، اس کا دل ٹوٹا جا رہا تھا، اس کی آرزوئیں پامال ہو چکی تھیں، اس کی محبّت کا دیا بُجھ چکا تھا، اب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا، راستہ گم، منزل ناپید، لیکن وہ ہراساں نہیں ہوئی، اس نے اپنے آپ کو سنبھالا، اور دل کی کیفیت چہرہ سے ظاہر نہیں ہونے دی،

عابدہ نے خبر سنانے کے بعد، نزہت سے کہا،

"کب آئیں گے واپس ؟"

وہ مُسکرائی،

"مَیں کیا جانوں !"

"یہ لو، تو پھر کیا مَیں جانوں ؟"

"اور کیا، اوپر آتے جاتے تو اکثر دیکھا ہے میں نے تمھیں !"

"اری پگلی ایسی بات مذاق میں بھی نہ کہنا !"

"کیوں ؟"

"تمھاری امّاں میری جان کو آجائیں گی !"

نزہت نے اس بات کا جواب نہ دیتے ہوئے کہا،

"جوڑ تو اچھا ہے، تیرے ان کے خیالات ایک ہیں، تو دل بھی ایک ہو جائیں گے، میرے ان کے خیالات جُدا ہیں، لہٰذا دونوں کا ملنا مشکل ہے ——"

"مَیں سمجھی !"

"کیا سمجھیں ؟"

"ضرور کچھ ان بن ہوگئی ہے، تم دونوں میں !"

آنسو، نزہت کی پلکوں تک آتے آتے رُک گئے، اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا،

"یہ تم سے انھی نے کہا ہوگا ؟ بڑی رازدار بن گئی ہو اب تو، کیوں ؟"

"چلو ہٹو بھی، ہمیں نہیں اچھی لگتیں یہ باتیں !"

"جاتی ہوں، اماں جان سے کہوں گی یہ گل کھل رہے ہیں اندر ہی اندر!"
نزہت اٹھی، عابدہ نے اس کا دامن پکڑ کر بٹھا لیا، کہا،
"تجھے خدا کی قسم!"
"چھوڑو مجھے، جانے دو!"
"جاؤ تو ذرا، ہنسی ہنسی میں قیامت برپا کرنا چاہتی ہو گھر میں؟"
عابدہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، نزہت مسکراتی ہوئی بیٹھ گئی، اتنے میں زلیخا پہنچی، اس نے نزہت کو مسکراتے اور عابدہ کو روتے ہوئے دیکھا، تو کہا،
"یہ کیا معاملہ ہے؟"
نزہت نے جواب دیا،
"رو رہی ہیں بے چاری!"
"کیوں؟"
"بتا تو میں بھی سکتی ہوں، لیکن انہی سے پوچھو۔"
زلیخا نے عابدہ سے پوچھا،
"کیا بات تھی بھئی؟"
اب وہ سنبھل چکی تھی، اس نے مسکراتے ہوئے کہا،
"چٹکی لے لی زور سے!"
"بڑی بری عادت ہے، میں بھی بہت پریشان ہوں تمھاری اس عادت سے!"
نزہت نے عابدہ سے کہا،

"کیوں ری، کہہ دوں سچّی سچّی بات!"

"آج تک تو کبھی سچ بولی بھی ہے؟"

"اچھا آج سہی، ہاں تو زلیخا ــــ" عابدہ نے بات کاٹی،

"پھر وہی شرارت؟ نہیں چپ رہو گی تم؟"

زلیخا نے کہا،

"یہ چٹکی وٹکی کا تو بہانہ ہے، کوئی خاص بات ہے!"

نزہت بولی،

"اور کیا، لیکن یہ عابدہ کہنے ہی نہیں دیتی!"

"تم اس کی پروا نہ کرو، کہہ ڈالو!"

"کسی اور سے تو نہیں تم سے کہہ دوں گی!"

"تو کہو!"

"اس وقت نہیں پھر کبھی!"

"نہیں ابھی کہو!"

"کان لاؤ ادھر!"

زلیخا نے کان بڑھا دیا، اور نزہت نے کان کی لو میں اس زور سے کاٹا کہ وہ بلبلا اٹھی،

"ہائے میرے اللہ!"

"اونھ، سنو تو!"

"میں باز آئی!"

"پھر نہیں کہوں گی کبھی، سُننا ہے تو ابھی سُن لو، بڑھاؤ کان"۔

"میں نے توبہ کی، مجھے کچھ سننا نہیں ہے، تم جانو اور عابدہ جانے، میں پرائے شگون میں اپنے کان کیوں کٹاؤں!"

عابدہ نے ایک زور کا قہقہہ لگایا،

"شکر کرو، ناک بچ گئی!"

اب رات بڑھ چلی تھی، زلیخا نے نزہت سے کہا،

"نہ بتاؤ ہم جانتے ہیں!"

وہ چلی گئی، عابدہ بھی اٹھی، نزہت نے کہا،

"تم کہاں چلیں؟"

"نیند آ رہی ہے سوئیں گے!"

"ابھی سے؟"

"ابھی سے کیا، دس تو بج گئے!"

وہ بھی چلی گئی!

اب نزہت اپنے کمرہ میں اکیلی تھی، وہ ادھڑ پلیٹ کر سونے کے لیے لیٹی اور لیٹتے ہی، تنویر اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا، وہی بگڑے ہوئے تیور، وہی درشتی اور سختی، وہی غصّہ، اور برہمی، تنویر کا یہ روپ نزہت نے پہلی بار دیکھا تھا، یہ بالکل نیا، اور بدلا ہوا تنویر تھا، وہ تنویر نہیں جو بات بات پر لقدِ جاں نثار کرنے کو تیار رہتا تھا، یہ وہ تنویر تھا جو اس کی توہین کر رہا تھا، جلی کٹی باتیں سنا رہا تھا، قطع محبت کی دھمکی دے رہا

تھا، بھول جانے، چھوڑ دینے اور فراموش کر دینے کا اعلان کر رہا تھا۔

نزہت سوچنے لگی، کیا محبّت اتنی ناپائیدار چیز ہے کہ برسوں کی ریاضت کے بعد بھی آن کی آن میں ختم ہو سکتی ہے، یہ رشتہ اتنا کمزور ہے کہ کچّے دھاگے کی طرح، ہر وقت ٹوٹ سکتا ہے؟ یہ افسانہ نگار اور شاعر بھی کتنے جھوٹے ہیں، لازوال محبّت کے گیت گاتے ہیں، امر محبّت کے افسانے سناتے ہیں، ان کے گیت بھی جھوٹے، ان کے افسانے بھی غلط، محبّت چیونٹی کی طرح ہر آن مسلی جا سکتی ہے، جن آنکھوں نے تنویر کا جوشِ محبّت دیکھا تھا، انھی آنکھوں نے اس کی بیزاری اور نفرت بھی دیکھ لی، محبت کے پروان چڑھنے میں برس ہا برس بیت گئے تھے اور نفرت کا کھیت چشم زدن میں اُگ آیا۔

اب میں کیا کروں گی؟ تنویر صاحب تو بڑے ٹھسّے سے دولہا بن کر کہیں اور اپنی بارات لے جائیں گے، کیا میں بھی کہیں اور دُلہن بن کر جا سکتی ہوں؟ چھی، چھی، ہرگز نہیں، قیامت تک یہ نہیں ہو سکتا، جو دل تنویر کے لیے وقف ہو چکا تھا، اب اور کوئی اس میں داخل نہیں ہو سکتا، دل کا دروازہ اگر کھل سکتا ہے تو صرف تنویر کے لیے، کسی اور کے لیے ہمیشہ بند رہے گا۔

نزہت جانتی تھی کہ تنویر سے محبت کرتی ہے، لیکن یہ محبت کتنی بے پناہ ہے، اس کا اندازہ آج ہُوا، تنویر کی کڑوی کسیلی باتوں کو وہ اب بھولتی جا رہی تھی، اس کی نگاہِ تصوّر کے سامنے اس وقت جو تنویر کھڑا تھا، اس میں پھر وہی شانِ محبوبیت آ گئی تھی، جو ہمیشہ سے تھی، جسے دیکھ دیکھ کر وہ جیتی تھی، جس پر اپنی زندگی قربان کر دینا چاہتی تھی۔

اب نزہت کا دل اسے ملامت کر رہا تھا، وہ اگر غصّہ میں تھے تو میں نے غصّہ کا جواب کیوں غصّہ سے دیا؟ زندگی اسی طرح کٹتی ہے؟ وہ غصّہ کریں میں نرم پڑ جاؤں، میں غصّہ کروں تو وہ ڈھیلے پڑ جائیں، زندگی میدانِ جنگ نہیں ہے، جہاں برابر کی چوٹ چلتی ہو، حملہ کا جواب حملہ سے دیا جاتا ہو، میرے ان کے خیالات جدا سہی، لیکن دل تو ایک تھے، میری جنگ جوئی نے آج دلوں میں بھی جدائی پیدا کر دی، مجھے حق ہے کہ میں اپنے خیالات پر سختی سے جمی رہوں، اگر انھیں ٹھیک سمجھتی ہوں، یہی حق انھیں بھی تو تھا، میں ان کی باتوں کا بُرا کیوں مان گئی؟ لڑنے کیوں لگی؟

اگر اس وقت تنویر یہاں موجود ہوتا، تو شاید، ابھی وہ دبے پاؤں اس کے کمرہ میں پہنچتی اور منا کر رہتی، لیکن وہ تو بنگال کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا، ریل کو اُلٹے پاؤں واپس نہیں بلایا جا سکتا، پھر کیا ہو؟ وہ کھڑ بھڑا کے بستر سے اٹھی اور میز پر جا کر خط لکھنے لگی، اس نے کئی صفحے لکھے، انھیں پڑھا اور پھاڑ ڈالا، بار بار خط لکھتی تھی اور چاک کر دیتی تھی، نہ معلوم کیا کیا لکھ جاتی تھی اور نہ جانے کیا سوچ کر انھیں پرزہ پرزہ کر دیتی تھی، آخری مرتبہ خط لکھتے لکھتے اسے خیال آیا خط کسے لکھ رہی ہوں؟ کیا معلوم وہ کہاں ہیں؟ ان کا پتہ کیا ہے؟ وہ کچھ بتا کر بھی نہیں گئے؟ یہ آخری خط بھی چاک کر دیا، دفعتہً یاد آیا وہ امّی جان سے وعدہ کر گئے ہیں لاہور جاتے وقت یہاں سے ہوتے ہوئے جائیں گے، بس یہ ٹھیک ہے، واپس آئیں پھر سمجھ لوں گی حضرت سے، دیکھوں گی غصّہ کیسے قائم رہتا ہے، میں

انھیں غصّہ دلا سکتی ہوں تو اسے ٹھنڈا بھی کر سکتی ہوں، وہ مطمئن ہو گئی اور خاموشی سے آکر، بستر پر لیٹ گئی، کروٹیں وہ اب بھی بدل رہی تھی، لیکن اب وہ بے کلی اور اُلجھن نہیں تھی، جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا، دل کا بوجھ اُتر گیا ہے۔

اور ریل ہوا سے باتیں کرتی، دھوئیں کے بادل اُڑاتی، اڑی چلی جا رہی تھی، تنویر اپنی برتھ پر خاموش لیٹا ہُوا تھا، نزہت کی رنگین اور دل آویز مسکراتی ہوئی، اور بجلی گراتی ہوئی، تصویر بار بار اس کی نگاہ تصوّر کے سامنے آتی تھی، لیکن وہ اسے دھکّے دے کر اپنی نظر کے سامنے سے ہٹا دینا چاہتا تھا، وہ اس کا تصوّر بھی نہیں کرنا چاہتا، اُسے یاد بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، اس کے خیال سے بھی وہ جھگڑنے لگتا تھا، ایسی ضدی، ہٹ دھرم، اور متعصب لڑکی سے میں محبّت نہیں کر سکتا، اس سے زندگی نبھ نہیں سکتی، جب بنیادی مسائل میں اس درجہ اختلاف ہے تو ایک دن بھی ہم خوش گوار زندگی نہیں بسر کر سکتے، اچھا ہُوا معاملہ ختم ہو گیا۔

پھر وہ سوچنے لگا، لیکن کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ مَیں نزہت سے دستبردار ہو سکتا ہوں؟ اسے گوارا کر سکتا ہوں کہ وہ کسی اور گھر کی زینت بنے؟ پھر اُس نے ایک جنگجو سپاہی کے انداز میں فیصلہ کیا، نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، قیامت تک نہیں ہو سکتا، وہ اگر میری نہیں بن سکتی تو کسی اور کی بھی نہیں بن سکتی جو اس کی طرف نظر اٹھائے گا، اس کی آنکھیں پھوڑ دوں گا، جو اس کی طرف ہاتھ بڑھائے گا، اس کی جان لے لوں گا، لیکن یہ سب باتیں مَیں

کیوں سوچ رہا ہوں ؟ وہ اگر میرے علاوہ کسی اور کی بن جائے، تو میں کس اختیار سے اُسے روک سکتا ہوں ؟ اور اس خیال سے میرے دل میں آگ کیوں بھڑکنے لگتی ہے ؟ شعلے کیوں اٹھنے لگتے ہیں ؟ کیا میں اب تک اس سے محبّت کیے جا رہا ہوں ؟ کیا اب تک وہ میرے دل پر حکمران ہے ؟ اب تک ؟ ——— یہ میری کمزوری ہے، محبّت کا کھیت میں نے خونِ جگر سے سینچا تھا، اُسے برباد ہوتا دیکھ کر اگر دل کڑھتا ہے تو یہ فطری بات ہے ؟ محبّت کے جنون میں زندگی کے کئی قیمتی سال بسر ہو چکے ہیں، یہ جنون رفتہ رفتہ دور ہوگا، فوراً نہیں ہو سکتا، لیکن اسے دور کرنا ہے، اس پر غالب آنا ہے، میں سپاہی ہوں اور سپاہی جو کچھ طے کر لیتا ہے، کر کے رہتا ہے اور اگر میں کامیاب نہ ہُوا ؟ کوئی حرج نہیں، پستول ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے، یہ جس طرح دوسروں کی جان لے سکتا ہے، میری زندگی کا خاتمہ بھی کر سکتا ہے ——— اور ریل تھی کہ بھاگتی چلی جا رہی تھی۔

مشاہدات

تنویر، غم اور صدمہ کا توشہ لے کر کلکتہ پہنچا، وہاں آزاد ہند فوج کے لوگوں اور کانگرس کے کارکنوں سے ملا، سرت بابو اور کرشنا رائے سے بھی اس کی ملاقات ہوئی، اچاریہ کرپلانی کی پریس کانفرنس میں بھی شریک ہوا، اچاریہ جی ابھی ابھی مشرقی بنگال پر طائرانہ نظر ڈال کر طیارہ پر واپس آئے تھے، اس پریس کانفرنس میں انھوں نے دل ہلا دینے والے واقعات بھی پیش کیے ایسا معلوم ہوتا تھا، بنگال میں ہزاروں چنگیز اور ہلاکو پیدا ہو گئے ہیں، جو شقاوت اور سنگدلی کے مظاہرے کر رہے ہیں، جنھوں نے بے گناہوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے، جو مکانوں میں آگ لگا رہے ہے، اور مسکینوں کو تہ تیغ کر رہے ہیں، اچاریہ جی کا بیان سن کر، اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، حاضرین کی نظریں اس پر پڑ رہی تھیں اور وہ شرم سے زمین میں گڑا جا رہا تھا، یہ نظریں اس سے کہہ رہی تھیں تو بھی مسلمان ہے، لاکھ کانگرسی اور وطن پرست سہی، ہم خوب جانتے ہیں،

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود !

بھیڑیئے کی اولاد بھی بھیڑیا ہی ہوتی ہے، وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا، کاش میرا نام تنویر کے بجائے رام لال ہوتا، البرٹ ہوتا، آئزک ہوتا، کرتار سنگھ ہوتا، کچھ ہوتا، تنویر ——— مسلمان ——— نہ ہوتا۔

پریس کانفرنس سے اُٹھ کر وہ باہر آیا، ایک ہاکر، مقامی کانگرسی روزنامہ "ہند" بیچ رہا تھا، اس نے بے تابی کے ساتھ پرچہ خریدا، اتنے میں اچاریہ جی باہر آئے، وہ پناہ گزینوں کے کیمپ کا معائنہ کرنے جا رہے تھے، وہ بھی ساتھ ہو لیا، وہاں جا کر اس نے ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچوں کو قطار اندر قطار، وقف اضطراب پایا، یہ اپنے گھر چھوڑ چھاڑ کر بھاگے تھے ان کا سب کچھ یا تو لُٹ گیا تھا، یا سراسیمگی کے عالم میں وہیں چھٹ گیا تھا، انھیں کپڑے کی ضرورت تھی، اناج کی ضرورت تھی، دوا کی ضرورت تھی، کانگرس اور مہاسبھا کے کارکن ان چیزوں کا بندوبست کر رہے تھے، آدمیوں کا ایک انبوہ کا انبوہ تھا، شور و شیون تھا اور چیخ و پکار کی آواز بلند ہو رہی تھی، یہ مناظر دیکھ کر تنویر کانپ اٹھا، وہ کیمپ سے باہر آ رہا تھا کہ وزیر اعظم بنگال مسٹر سہروردی آتے دکھائی دیے، اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا، اور آگے بڑھ گیا۔

گھومتا گھامتا، رات کو گیارہ بجے کے قریب وہ اپنی قیام گاہ پر پہنچا، تھک گیا تھا، اس لیے فوراً لیٹ گیا، پھر خیال آیا کہ ارے آج کا ہند تو پڑھا ہی نہیں، کوٹ کی جیب سے اخبار نکالا اور بستر پر لیٹے لیٹے پڑھنے لگا۔

پناہ گزینوں کے متعلق اس نے ایک خبر پڑھی کہ بھگائے ہوئے نہیں بھاگے ہوئے ہیں، ان پر ایسی دہشت اور سراسیمگی مسلط ہوئی کہ بے سر و سامانی کے عالم میں اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، پھر اپیل کی گئی تھی کہ یہ اپنے اپنے مقامات پر جا کر آباد ہو جائیں۔

اس خبر کو اس نے شرارت سے تعبیر کیا، یہ مظلوم وہاں پھر بس جائیں، کیا خوب، زہر دے اس پر یہ تاکید کہ پینا ہوگا۔

پھر مسٹر سہروردی کا بیان نظر سے گذرا جس میں کہا گیا تھا کہ قتل کے واقعات دو ڈھائی سو سے زیادہ نہیں ہوئے، جبری تبدیلی مذہب، اور شادی کے واقعات تین چار سے زیادہ نہیں ہوئے، مقامی اور بیرونی اخبارات اور لیڈروں نے، اس سلسلہ میں جو غلط مبالغہ آمیز اور اشتعال انگیز طریقہ پروپیگنڈے کا اختیار کر رکھا ہے، اس سے فائدہ کے بجائے بہت سخت نقصان پہنچ رہا ہے، لہٰذا اسے جس قدر جلد بند کر دیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔

یہ بیان پڑھ کر وہ غصہ سے بے قابو ہو گیا، دل ہی دل میں کہنے لگا، دھاندلی کی کوئی حد ہے، واقعات پر پردہ ڈالنے سے کہیں پردہ پڑ سکتا ہے؟ حقیقت چھپانے سے کہیں چھپ سکتی ہے؟ وزیر اعظم صاحب اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ چونکہ وزیر اعظم ہیں لہٰذا، ان کا ہر قول تسلیم کر لیا جائے! خواہ وہ کتنا ہی غلط اور بے بنیاد کیوں نہ ہو!

ورق الٹا، تو ایک عجیب و غریب خبر نظر سے گزری، اس خبر میں

یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ، مسٹر رائے کے بال بچے صحیح سلامت ہیں ——— اور عبدالغفران ایم ایل اے نے انھیں اپنی حفاظت میں اپنے بجرے پر سوار کر کے ہندوؤں تک بعافیت تمام پہنچا دیا، اور بعض ذمہ دار لوگوں کے بیان میں ان کے قتل کی جو اندوہناک تفصیل پورے جزئیات کے ساتھ بیان کی تھی وہ بالکل غلط تھی!

تنویر یہ خبر پڑھ کر آنکھیں ملنے لگا، اس نے بار بار یہ خبر پڑھی اور ہر مرتبہ شک و شبہ کے بحر بے پایاں میں غوطے کھانے لگا، وہ بار بار ورق اُلٹ کر، اطمینان کر لیتا تھا کہ یہ اخبار "ہند" ہی ہے، عصر جدید نہیں ہے، پھر پڑھتا تھا، خبر موجود تھی، لیکن اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا، کیونکہ اس خبر کو ہونے والے صدر کانگرس اچاریہ کرپلانی نے بھی اپنے بیان میں بسط و تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا تھا،

وہ کوئی رائے قائم نہ کر سکا، ایک طرف خبر تھی، ایک طرف بیان تھا، کسے سچ سمجھے؟ کسے جھوٹ مانے؟

کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے!

آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اب کوئی مزید خبر نہ پڑھی جائے، لیکن ایڈیٹوریل ضرور پڑھنا چاہیئے، اس میں یقیناً گذب و دروغ کے اس انبار کی پردہ کشائی کی گئی ہوگی اور ان مسلم لیگی خبروں کے جھوٹ کو نمایاں کیا گیا ہوگا!

ایڈیٹوریل پڑھنا شروع کیا، پورا پڑھ ڈالا، لیکن حیرت کی کوئی حد نہ رہی، جب اس نے دیکھا کہ اداریہ میں، ان تمام خبروں ———

کی صحت تسلیم کی گئی تھی اور اپیل کی گئی تھی کہ بگڑی ہوئی فضا کو سچ سے اجتناب کرکے اور غلط بیانی کو شعار بنا کے اور زیادہ نہ بگاڑا جائے۔

اخبار، تنویر کے ہاتھ سے گر پڑا، اور سوچنے لگا، یا تو یہ اخبار اب کانگرسی نہیں رہا ہے اور یا میری آنکھیں ٹھیک کام نہیں کر رہی ہیں گرے ہوئے اخبار کو اس نے پھر نہیں اٹھایا، وہیں پڑا رہنے دیا اور خود کروٹیں بدلنے لگا، اور آخر کار سو گیا۔

سویرے اٹھ کر وہ مشرقی بنگال کے دورہ پر روانہ ہونے والا تھا کہ صبح کے امرت بازار پتریکا میں خبر پڑھی کہ گاندھی جی آج کلکتہ آ رہے ہیں اور کل وہ مشرقی بنگال کے دورہ پر روانہ ہو جائیں گے، اور اس وقت وہاں مقیم رہیں گے، جب تک حالات سازگار نہ ہو جائیں یہ پڑھ کر اس نے اپنا عزم سفر ملتوی کر دیا اور طے کیا کہ اب وہ گاندھی جی کے ساتھ نواکھالی جائے گا!

وہ گاندھی جی کے استقبال میں، اور بعد کو پرارتھنا میں شریک ہوا، پھر اس نے ان کے ساتھ نواکھالی چلنے کی خواہش ظاہر کی، انھوں نے اظہار شفقت کرتے ہوئے اس کی درخواست منظور کر لی اور دوسرے دن وہ ان کے ساتھ سفر پر روانہ ہو گیا۔

گاندھی جی جہاں جہاں پہنچے تنویر ان کے ساتھ گیا، کلکتہ میں اس نے انگریز کمانڈر، متعینہ مشرقی بنگال کا ایک بیان پڑھا تھا، جس میں اس نے کہا تھا کہ نواکھالی کے حوادث نہ کسی منظم سازش کا نتیجہ ہیں، نہ عوامی حملہ

کا، یہ صرف بیکار فوجیوں، غنڈوں اور پیشہ ور بدمعاشوں کی کارستانیاں ہیں،
یہ بیان پڑھ کر دل ہی دل میں "اینگلو مسلم لیگ اتحاد" پر اس نے لعنت بھیجی
تھی اور اس بیان کا ایک حرف بھی درست ماننے سے انکار کر دیا، لیکن جب
وہ گاندھی جی کے ساتھ مواضعات میں گھوما، حالات کا اس نے خود مشاہدہ کیا،
اور واقعات کی تحقیق کی، تو کمانڈر کا ایک ایک حرف درست ثابت ہوا، اس
نے دیکھا کہ مسلمان گاندھی جی کا سواگت کر رہے ہیں، ان کی پرارتھنا میں
شریک ہو رہے ہیں، جو کچھ ہو چکا ہے اس پر ندامت اور شرمساری کا اظہار
کر رہے ہیں، اور اس کے علاوہ اپنے مفرور پڑوسیوں کو پھر سے دعوت اقامت
دے رہے ہیں اور ان غنڈوں اور شورہ پشتوں کے خلاف اظہار نفرت کر رہے
ہیں، جو ان ذلیل حرکات کے ذمہ دار تھے۔

گاندھی جی آہستہ خرامی کے ساتھ دورہ کر رہے ہیں، اور تنویر امکانی عجلت
کے ساتھ نواکھالی اور پٹرہ کے تمام مواضعات کو کھنگھال ڈالنا چاہتا تھا،
لہٰذا چند روز کے بعد وہ گاندھی جی کا ساتھ چھوڑ کر خود تن تنہا دورہ پر
نکل کھڑا ہوا، اس نے ایک ایک قریہ، ایک ایک دیہات اور ایک ایک
گاؤں کا دورہ کیا، مسلمانوں سے ملا، ایک ایک چیز، ایک ایک واقعہ،
اور ہر ہر حادثہ کی سی آئی ڈی کی طرح تحقیق کی، اس نے جلے ہوئے
کھنڈر دیکھے، اس نے پامال کھیتیاں دیکھیں، اس نے خالی گھر
دیکھے، اس نے شکستہ عبادت گاہیں دیکھیں، اس نے تباہیوں اور ہلاکتوں
کی داستانیں سنیں، اس نے قتل و غارت کے واقعات معلوم کیے،

اس نے جبری تبدیل مذہب اور شادی کے واقعات کا کھوج لگایا، اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ بلاشبہ کئی سو ہندو بے دردی سے قتل کیے گئے، لیکن صرف چند سو، چند ہزار نہیں، یہ چند سو کا عدد بھی کافی دل دوز ہے، لیکن اس حادثہ کو عوامی حیثیت نہیں دی جا سکتی، یہ شورہ پشتوں کی جماعت کا کام تھا جس کا بعض مواضعات میں خود مسلمانوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور اپنے ہندو ساتھیوں کی جان و مال کو دستبرد سے بچانے کی کوشش کی، وہ اس نتیجہ پر بھی پہنچا کہ جبری تبدیل مذہب اور شادی کا اگر ایک واقعہ بھی ہوا، تو بہت برا ہوا، اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے لیے ننگ، لیکن ان حوادث کی تعداد، بہرحال چند سے زیادہ نہ تھی، حالانکہ اسے سینکڑوں تک بیان کیا جا رہا تھا، اپنی ذاتی تحقیقات کے بعد، اس نے تسلیم کر لیا کہ مشرقی بنگال کے واقعات کی تشہیر میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ ہے اور رنگ آمیزی میں بڑے بڑے اخبارات اور بڑے بڑے لیڈر بحصّۂ مساوی شریک تھے، اور یہ بہت بڑی کمزوری اور کوتاہی تھی، اس سے سارے ہندوستان میں خطرناک طور پہ اشتعال پھیل رہا تھا، ان اخباروں اور لیڈروں کا کام یہ تھا کہ افواہوں اور اشتعال انگیزیوں کو روکیں، نہ کہ پھیلائیں، اس نے غور و فکر کے بعد ایک بہت مفصّل اور پُر اثر خط گاندھی جی کی خدمت میں لکھا اور ان سے اپیل کی کہ وہ اپنے اثر کو کام میں لا کر اس سلسلہ کو جلد از جلد بند کرائیں، ورنہ نتائج نہایت ہولناک ہوں گے۔

اگرچہ تنویر کو یقین ہو گیا تھا کہ مشرقی بنگال کے واقعات بڑھا چڑھا کر

پیش کیے گئے ہیں، جان اور مال کا نقصان اس سے بہت کم ہوا ہے، جتنا چرچا ہو رہا ہے، پھر بھی جو کچھ ہو چکا تھا، وہ بھی بہت تھا، اس کی ذمہ داری اگر غنڈوں اور شورہ پشتوں پر تھی، تو وہ بھی بہرحال مسلمان ہی کہلاتے تھے، لہٰذا ہر مسلمان کا فرض تھا کہ اس داغ کو دھونے کی کوشش کرے، اور ثابت کر دے کہ جو لوگ ان حادثات میں ملوث تھے، وہ ہندوؤں کے نہیں، اسلام اور مسلمانوں کے دشمن تھے، اگرچہ ان کے نام مسلمانوں ہی کے سے ہیں۔

اس داغ کو دھونے میں تنویر نے اپنی پوری قوت صرف کر دی، وہ دیوانہ وار مواضعات کا دورہ کرتا تھا، مسلمانوں کو بے باکی کے ساتھ، ان حوادث کے وقوع پر ملامت کرتا تھا، اپنی پُرزور تقریروں میں ان سے اپیل کرتا تھا کہ وہ اگر واقعی مسلمان ہیں، تو انھیں اسلام کے احکام کے خلاف نہ چلنا چاہیئے۔ اسلام جبری تبدیلی مذہب کا سخت مخالف ہے، لا اکراہ فی الدین، اسلام ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا کہ بے گناہوں کو مارا جائے لا تزر وازرۃ وزر اخری، اسلام عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور بیماروں کی حفاظت پر خاص زور دیتا ہے، لا یجرمنکم شنان قوم ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی، پھر تم کیسے ننگِ اسلام مسلمان ہو کہ تمھاری آنکھوں کے سامنے، تمھاری موجودگی میں، بلکہ ایک حد تک تمھاری اعانت اور شرکت سے اسلام کے اصولوں کو توڑا گیا، عورتوں کو مارا گیا، بے گناہوں کو قتل کیا گیا، مکانات جلا دیے گئے، کھیت

برباد کیے گئے؟ اگر تمھارے اندر ذرّہ برابر بھی اسلام کا نور موجود ہے، تو تمھیں بے جھجک اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنا چاہیئے، اپنے پڑوسیوں کو واپس بُلانا چاہیئے، ان کے جلے ہوئے اور لوٹے ہوئے گھروں کو خود بنانا چاہیئے، ان کے نقصان کی تلافی کرنا چاہیئے، ان کا لُوٹا ہوا مال واپس کر دینا چاہیئے، اور ان عورتوں کو جن کا مذہب بدل کر مسلمانوں سے شادی کر دی گئی ہے، پھر سے ہندو بنا کر ہندوؤں میں واپس کر دینا چاہیئے، اگر یہ تم یہ نہیں کر سکتے، تو تم مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں ہو، قیامت تک اسلام تم سے پناہ مانگے گا، اور قیامت کے دن تم شافع محشر کی شفاعت سے محروم رہو گے، تنویر اب باقاعدگی کے ساتھ نماز پڑھنے لگا تھا، اور یہ تقریریں زیادہ تر مسجدوں ہی میں کرتا تھا، ان تقریروں کا شروع شروع میں تو بہت زیادہ اثر نہیں ہُوا، لیکن رفتہ رفتہ وہ دلوں میں گھر کرنے لگیں، اور لوگ اس کی باتوں کو توجہ اور غور کے ساتھ سُننے لگے، ایک مندر کی مقدس طلائی تلواریں، جو لُوٹ مار کے زمانہ میں غائب کر دی گئی تھیں، جب ان کی بازیافت کے لیے گاندھی جی کی چیلی مس اُمتِ السلام نے مرن برت رکھا، تو وہ تنویر ہی کی جد وجہد سے واپس ہوئیں، اس طرح اس نے اَن پڑھ اور جاہل، لیکن مخلص اور سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔

وہ بڑے جوش و خروش، شغف و انہماک کے ساتھ، اپنی رضاکارانہ خدمات مشرقی بنگال میں انجام دے رہا تھا اور کامیاب ہو رہا تھا، لیکن

کام اور خدمت کرنے کے بعد، دل کو جو سکون حاصل ہوتا ہے، اس سے وہ محروم تھا، ایک کھٹک سی ہوتی رہتی تھی دل میں، ایک مظلوم، دردمند، سینہ فگار، لیکن جنگ جو لڑکی کی تصویر ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے پھرا کرتی تھی اور یہ لڑکی نزہت کے سوا اور کون ہو سکتی تھی؟

تنویر جب پٹنہ سے چلا اور بنگال آیا، تو نزہت سے بہت خفا تھا، اس کی یاد کو، لڑ لڑ کر، اپنے دل سے دور رکھتا تھا، پھر جب وہ کلکتہ پہنچا اور مشرقی بنگال کے دورہ پر روانہ ہوا، تو اپنے فرائض میں اس درجہ منہمک تھا، کہ واقعی وہ نزہت کو، اس کی رعنائیوں کو، اس کی دلآویزی اور سحر طرازی کو بھول گیا، وہ اپنی دھن میں مست تھا، نہ اسے نزہت یاد تھی، نہ اس کی دل موہ لینے والی ادائیں اور باتیں، لیکن گاندھی جی کے ساتھ رہ کر اور گاندھی جی کا ساتھ چھوڑ کر، خود مشرقی بنگال کے ایک ایک گوشہ کا دورہ کر کے وہ اب محسوس کر رہا تھا کہ اس نے نزہت کے ساتھ زیادتی کی۔ اس کی سچی باتوں کو جھٹلایا، اس کا دل توڑا، اس کی توہین کی، اس کے ساتھ غیر شریفانہ برتاؤ کیا، وہ اب دل میں نادم تھا، بالکل اسی طرح جیسے نواکھالی کے غلط کار مسلمان ہندوؤں پر ظلم کر کے شرم سار تھے، ان مسلمانوں کو اظہار ندامت اور تلافی مافات کا موقعہ حاصل تھا، لیکن وہ اس سے بھی محروم تھا، نزہت اس سے دور بہت، دور تھی، اتنی دور کہ شاید اب اس تک پہنچنا آسان نہیں تھا، اور تلافی مافات؟ ——— وہ کس طرح ممکن ہے؟ اسے خط لکھوں اور دل کھول کر رکھ دوں؟

نہیں یہ بے کار ہے، قلم دل کی ترجمانی نہیں کر سکتا، مجھے خود جانا چاہیئے
اور سر ندامت اس کے قدموں پر رکھ دینا چاہیئے، میری نزہت! میرے
دل کی رانی! ——— وہ مجھ سے خفا ہے، میں اسے خوش کر سکتا ہوں لیکن
خط لکھ کر نہیں، اس کے سامنے اپنا دل رکھ کر جاؤں کیسے؟ جب تک یہاں
کے حالات سازگار نہ ہو جائیں، اس وقت تک قدم بھی باہر نہیں نکل سکتا، جب
تک صرف اس کے تصوّر سے جی بہلاؤں گا، اور یہ سوچتے سوچتے، اس کے
تصوّر کی آنکھوں کے سامنے مسکراتی ہوئی نزہت آ کر کھڑی ہو گئی،
وہی معصومیت، وہی اٹھڑپن، وہی شوخی، وہی تیزی!
اللہ یہ وہی ہیں جن کو ترس گیا ہوں!

نغمۂ شادی

افتخار صاحب کی خواہش تھی کہ احتشام اور نزہت کی شادی، ساتھ ساتھ زلیخا اور تنویر سے کی جائے، لیکن ان کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی، جسٹس اکبر علی کی طرف سے اگرچہ تنویر کے لیے باقاعدہ شادی کا پیام آگیا تھا اور وہ یہاں سے منظور بھی کر لیا گیا تھا، لیکن بظاہر یہ شادی ایک سال سے پہلے نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ اکبر علی یہ چاہتے تھے کہ جس روز تنویر کی شادی ہو، اسی دن وہ لڑکی کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں اور کوثر کی بھی شادی کر دیں، کوثر کے پیام کئی جگہ سے آ چکے تھے، لیکن کوئی شخص اب تک جچا نہیں تھا، جسے وہ اپنا داماد بنا سکیں، اور یہاں یہ معاملہ تھا کہ انعام کو ہندوستان کے امریکی سفارت خانہ میں ایک معقول جگہ مل گئی تھی، ایک طویل مدت کے لیے امریکہ کو جا رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے سامنے زلیخا کے ہاتھ پیلے کرا دے، چنانچہ اس نے افتخار صاحب پر زور ڈالا، اور بالآخر وہ راضی ہو گئے اور احتشام کو منہ مانگی مراد ملی۔

دن رگنے جاتے تھے جس دن کے لیے!

طے یہ ہوا کہ شادی کی تقریب رسالپور میں انجام پائے، یہ ایک گاؤں، پٹنہ سے ۵۰-۶۰ میل کے فاصلہ پر واقع تھا، افتخار صاحب کا مستقل وطن یہی تھا، پٹنہ میں تو وہ اپنی لیڈری کی وجہ سے رہنے پر مجبور تھے، یہاں ان کی ایک خوش نما کوٹھی "نشیمن" کے نام سے موجود تھی۔ خاندان کے دوسرے افراد زیادہ تر یہیں رہتے تھے، صرف افتخار صاحب مع اپنے مخصوص متعلقین کے پٹنہ میں مقیم تھے۔

کوچ کا حکم ملا، سامان بندھنے لگا، اور دوسرے دن، سب لوگ رسالپور پہنچ گئے اور یہاں آتے ہی زور شور سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں، افتخار صاحب اپنے چھوٹے لڑکے کی شادی بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے کرنا چاہتے تھے، لیکن دل کے حوصلے نکالنے کا موقعہ نہ تھا، انعام نے اتنے وقت میں الٹی میٹم دیا تھا کہ دل کی دل ہی میں رہی جا رہی تھی، پھر بھی اس مختصر مدت میں انھوں نے جتنے زیادہ انتظامات ممکن تھے کر لیے، جتنے زیادہ سے زیادہ آس پاس کے دوست، احباب اور اعزاء، اقربا بلائے جا سکتے تھے، بُلا لیے، دن عید تھا، رات شب برات، ہر وقت ایک عجیب چہل پہل اور گہما گہمی رہنے لگی تھی۔

نزہت اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی اطمینان سے زلیخا کا شہانہ جوڑا سی رہی تھی کہ عابدہ آ گئی، اس نے آتے ہی شرارت شروع کر دی، کمر پر ہاتھ رکھ کر عارفانہ انداز میں بولی۔

"کیا ہو رہا ہے؟"

نزہت نے کام کرتے ہوئے جواب دیا،

"دیکھ تو رہی ہو!"

"میں پوچھتی ہوں یہ کس کا جوڑا سل رہا ہے؟"

"دُلہن کا!"

"جھوٹی کہیں کی!"

نزہت نے سُوئی ہاتھ میں لیے لیے نظر اٹھا کر عابدہ کی طرف دیکھا اور کہا

"کیا مطلب؟"

"یہ جوڑا تمھارا ہے!"

"میرا؟"

"ہاں تمھارا، تم چپکے چپکے اپنی شادی کی تیاریاں کر رہی ہو، اور بدنام کر رہی ہو غریب زلیخا کو، کیوں؟ کہوں جا کے اماں جان سے ابھی!"

"جاؤ میں بھی کہہ دوں گی!"

"تم کیا کہو گی؟"

"وہی اس روز والی بات!"

دونوں کی نظر ایک دوسرے سے ملی، دونوں مسکرا دیں،

عابدہ نے کہا،

"جوڑا پھر سیتی رہنا چلو چلیں!"

"کہاں؟"

"ذرا زلیخا کے کمرے تک، بیچاری اپنے کمرہ میں قید ہے، نہ کہیں آنے کی

نہ جانے کی!"

"تم جاؤ میں نہیں جاتی!"

"کیوں؟"

"میری مرضی!"

"میں تو تمھیں لے کر جاؤں گی!"

"دیکھ لوں گی۔"

نزہت پھر اپنے کام میں لگ گئی، عابدہ پاس آئی، نزہت نے کہا،

"قریب آئی، تو اللہ قسم سوئی گڑھ دوں گی، دور ہی رہنا!"

عابدہ ٹھٹک گئی، اس نے کہا،

"تمھیں میری جان کی قسم!"

"کیا؟"

"چلو!"

"ابھی نہیں!"

"نہیں ابھی!"

"اتنا سارا کام پڑا ہے، میں نہیں جاتی!"

"میں ہاتھ بٹا لوں گا!"

"جھوٹی کہیں کی!"

"سچ اللہ قسم!"

"اونھ ـــــ بڑی ضدی ہو چلو!"

دونوں زلیخا کے کمرہ میں پہنچیں وہ خاموشی سے لیٹی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی،
عابدہ نے پہنچتے ہی کہا،

"خیر تو ہے، کیا سوچا جا رہا ہے؟"

زلیخا نے کوئی جواب نہ دیا، اٹھ کر بیٹھ گئی، عابدہ نے پھر چھیڑا،

"بتاؤ میں کیا پوچھ رہی ہوں؟ ارے کچھ خبر بھی ہے بسنت کی؟ تم تو اچھی خاصی پاگل ہو، تمھیں کچھ پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے؟"

زلیخا مسکرائی، اس نے کہا،

"اگر پاگل ہوں تو تمھاری محبت میں!"

نزہت نے کہا،

"آج تم نے لاجواب کر دیا، عابدہ کو بھئی ہم مانتے ہیں!"

عابدہ نے نزہت کو چھیڑا،

"اسی لیے آئی ہو؟"

"پھر کس لیے آئی ہوں؟"

"بیکار باتیں چھوڑو کام کی بات کرو۔"

"یعنی؟"

"انھیں (زلیخا) کو وہ خبر سنا دو!"

"کون سی خبر؟"

"اے ہے بڑی بھولی!"

نزہت نے حیرت سے عابدہ کو دیکھتے ہوئے کہا،

"میں نہیں جانتی خبر وبر کچھ!"

"وہی یا مظہر العجائب والی!"

"کون سی؟"

"اونھ، جیسے انھیں کچھ معلوم ہی نہیں، وہی، یا مظہر العجائب، دولہا مع بارات غائب۔"

"کیا بک رہی ہے تو؟"

"تم سے کام نہیں چلے گا، میں خود کہے دیتی ہوں، سب کچھ زلیخا سے!"

اب زلیخا نے کان کھڑے کیے کہ وہ کون سی خبر ہے، جو یہ لائی ہے، اس نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"میں کہتی ہوں دنیا میں یہ ہوتا ہی رہتا ہے، ایسی باتوں کا غم کیا!"

نزہت اور زلیخا دونوں عابدہ کی سنجیدہ باتوں کو بڑے غور سے سن رہی تھیں اور خاموش تھیں، عابدہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا،

"ایسی امید نہیں تھی ——— ہائے میں کہتی ہوں، احتشام بھیّا کا دل ہے یا پتھر؟"

نزہت نے کہا،

"پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو، کیا بات ہوئی صاف صاف کہو نا!"

"شادی سے انکار کر دیا میں کہتی ہوں چراغ لے کر ڈھونڈیں گے تو زلیخا جیسی دلہن نہیں ملے گی!"

یہ سنتے ہی زلیخا کا چہرہ سفید پڑ گیا، نزہت کچھ کہنے والی تھی کہ عابدہ نے پھر اپنی باتیں شروع کر دیں،

"وہ شادی نہیں کریں گے، تو زلیخا بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی نہیں رہے گی، اے ہاں اور کیا! تم نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی، ایک نہیں ہزار شوہر اسے مل سکتے ہیں ابھی اور آج!"

زلیخا نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور گلوگیر آواز میں کہا،

"یہ نہ کہو!"

قبل اس کے کہ عابدہ جواب دے، نزہت نے ایک دوہتڑ عابدہ کی پیٹھ پر زور سے جمایا۔

"کیوں ری اس لیے مجھے لائی تھی یہاں؟"

عابدہ نے پیٹھ سہلاتے ہوئے معصومانہ لہجہ میں کہا،

"اور کس لیے لائی تھی!"

نزہت ہنستی ہوئی زلیخا سے لپٹ گئی۔

"خدا قسم جھوٹ، تم اس کی کسی بات کا کبھی اعتبار نہ کرنا، صرف تمھیں چڑا رہی ہے عابدہ!"

زلیخا کی جان میں جان آئی، اس کا اترا ہوا چہرہ پھر شگفتہ ہو گیا وہ سوچنے لگی تھی، میں ایک یتیم اور بے آسرا لڑکی ہوں، ہو سکتا ہے کہ عابدہ سچ کہہ رہی ہو، لیکن نزہت کی باتوں نے اس کا فکر دور کر دیا۔

نزہت نے عابدہ سے کہا،

"زلیخا کی شادی تو ہو گی اور بیچ کھیت ہو گی، کل ہی ہو گی، انشاء اللہ، تم اپنی کہو ——"

"خیریت ہے اور خیریت آپ کی بدرگاہ رب العزت نیک مطلوب!"

"جی نہیں اس بھول میں نہ رہیئے گا!"

"کس بھول میں؟"

"اپنی شادی کی!"

"اس کا کیا ذکر!"

"انعام بھیا امریکہ جا رہے ہیں، سال دو برس تک تو وہاں سے آنے کے نہیں!"

"تو؟"

"تم کیا کرو گی سوتا رے گننے کے!"

زلیخا مسکرانے لگی، اس نے عابدہ کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا،

"اب بتاؤ!"

عابدہ نے بے پروائی کے ساتھ کہا،

"بکتی ہے، بکنے دو!"

"اگر تم نے ایسی باتیں کیں تو میں پیشگوئی بھی کر دوں گی!"

"فرمایئے! پنڈت جی، آپ کا جوتش کیا کہتا ہے؟"

"انعام بھیا امریکہ سے ایک گل اندام رفیقہ حیات ساتھ لے کر آئیں گے اور تم یونہی منہ دیکھتی رہ جاؤ گی!"

زلیخا نے کہا،

"میرے بھیّا ایسے نہیں ہیں!"

"وہ بنا دے گی!"

"کون؟"

"وہی ان کی ہونے والی امریکن بیوی!"

زلیخا ہنسنے لگی، عابدہ نے تیکھے لہجے میں کہا،

"یہاں کس کو پروا ہے!"

"یہ تو اپنے اُترے ہوئے چہرے سے پوچھو، لاؤں آئینہ!"

عابدہ نے کوئی جواب نہیں دیا، کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی، نزہت نے کہا،

"میری مان تو ایک کام کر!"

"کون سا کام؟"

"چل جا، اور جب قاضی صاحب زلیخا کا نکاح پڑھانے آئیں تو ان کا ہاتھ اور انعام بھیّا کا دامن پکڑ لے اور کہہ دے صاف صاف پہلے میرا نکاح باندھو، پھر کسی اور طرف رخ کرنا! بس پھٹ سے کام بن جائے گا!"

"شکریہ اس مشورے کا!"

عابدہ جانے کے لیے اٹھی، نزہت نے پوچھا،

"کہاں چلیں؟"

"جائیں گے، بہت سے کام کرنے ہیں!"

زلیخا نے کہا،

"روٹھ گئیں!"

"روٹھے میری بلا!"

وہ چلی، نزہت نے اُسے پکڑ کر کھینچا، عابدہ نے کہا،

"جانے دو بھئی!"

"نہیں جانے دیں گے!"

"کچھ زبردستی ہے؟"

"یہی سمجھ لو!"

"میں تو جاؤں گی۔"

"اچھا چلی جانا، پہلے ایک بات سُن لو!"

"میں نہیں سنتی!"

"بات نہیں خوش خبری!"

عابدہ بیٹھ گئی، نزہت نے کہا،

"رات انتصار بھیّا اماں سے کہہ رہے تھے، زلیخا اور عابدہ دونوں کی شادیاں ساتھ ساتھ، اہتشام اور انعام سے کر دی جائیں تو کیا حرج ہے!"

زلیخا، خوشی سے بے تاب ہو کر بولی،

"سچ سچ!"

نزہت نے کہا،

"اللہ قسم بالکل سچ۔"

زلیخا نے عابدہ کو پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا اور نزہت سے پوچھا،

"پھر کیا ہوا؟"

"دونوں کی شادی ہوگی!"

"پھر مذاق، سچ سچ بتاؤ!"

"کہہ تو رہی ہوں ——— اماں راضی ہوگئیں، آج ابّا سے طے کرنے کو کہہ رہی تھیں، ممکن ہے کر بھی چکی ہوں، کل تمھارے ساتھ ساتھ یہ بھی دلہن بن جائے گی!"

عابدہ کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا، اس نے زلیخا سے کہا،

"جسے جھوٹ بولنا سیکھنا ہو، وہ نزہت کو استاد بنالے!"

نزہت بولی،

"دیکھ لینا کل کیا ہوتا ہے، پھر جھک کر سلام کریں گے ہم!"

اسی اثنا میں نزہت کی امّی جان آگئیں، انھیں دیکھتے ہی زلیخا پھر مسکرا کر بیٹھ گئی، عابدہ بھی خاموش بیٹھی رہی، نزہت نے کہا،

"امّی جان عابدہ کا کیا ہوا؟"

"اسے بھی لے جاکر مالیوں بٹھادے، کل خیر سے نکاح ہے!"

جب وہ چلی گئیں، نزہت نے عابدہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا،

"چل! ——— پہلے مجھے مٹھائی کھلا، پھر مالیوں بیٹھ!"

"میں نہیں بیٹھتی!"

"تو کہہ دوں امّی جان سے تجھے یہ نکاح منظور نہیں ہے!"

"چیختی کیوں ہے، چل!"

نزہت نے ایک دوسرے کمرے میں لے جاکر، عابدہ کو مایوں میں بٹھادیا، شروع شروع میں عابدہ، انعام سے محبت نہیں کرتی تھی، اُسے پسند ضرور کرتی تھی، جب اُسے یہ معلوم ہُوا کہ شادی انعام سے ہوگی، تو وہ اسے اور زیادہ پسند کرنے لگی اور جب وہ مایوں میں بے نشان و گماں، دفعتہً بٹھادی گئی تو اس کی پسند محبت بن گئی!

اور دوسرے روز، شہنائیوں کے شور، اور خیر خواہوں کے ہجوم میں زلیخا اور عابدہ کی شادی، احتشام اور انعام کے ساتھ ہوگئی!

خطرہ

انعام اور انعام کی شادی زلیخا اور عابدہ سے ہوگئی، پہلی شادی، محبت کی شادی تھی، دوسری شادی، خاندانی تعلقات پر مبنی تھی، لیکن شاید اندر ہی اندر، انعام اور عابدہ کے دل ایک دوسرے کی طرف کھنچ رہے تھے، کھنچتے جا رہے تھے، شادی کے بعد، انعام نے ایک مہینہ کی رخصت لے لی اور طے کر لیا کہ رسالپور ہی میں باقاعدہ "ہنی مون" منا کر امریکہ جائے گا، بس چلتا، تو شاید عابدہ کو ساتھ لیتا جاتا، لیکن ادھر چند روز سے، نواکھالی کے واقعات نے سارے بہار کو، آتش فشاں پہاڑ بنا دیا تھا، شہر اور دیہات ہر جگہ ایک کش مکش، برہمی، اضطراب، نفرت اور عناد کی کارفرمائی نظر آتی تھی، ان حالات میں انعام کو نہ خود فوراً امریکہ جانا مناسب معلوم ہوا، نہ یہ اچھا تھا کہ اور تو سب تو یہیں رہیں، مگر عابدہ کو اپنے ساتھ لیتا جائے۔ اس نے طے کیا کہ حالات ذرا سازگار ہو جائیں، تب خود جائے اور جب بالکل قابو میں آ جائیں، تب عابدہ کو بلا لے۔

عبدل آج کل بہت سہما سہما سا نظر آتا تھا، کچھ گھبرایا ہوا، بے چین سا،

ایک روز انعام نے احتشام سے کہا، فساد کی آگ بہار میں بھی پھیلتی جا رہی ہے ہمیں کچھ احتیاطی تدابیر کر لینی چاہئیں، دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کے پیتا ہے، بینی آباد کے حادثہ نے مجھے بہت چوکنا بنا دیا ہے، احتشام نے مسکراتے ہوئے، بے فکری اور بے پروائی کے انداز میں کہا" جناب بزدل صاحب، یہ رسالپور ہے، بینی آباد نہیں، یہاں کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ہوا تو پہلے ہم آپ پر تصدق ہو جائیں گے، پھر آپ ملک الموت کی بارگاہ میں شرف باریابی حاصل کیجئے گا، انعام ہنس کر چپ ہو رہا، احتشام چلا گیا، اس کے جانے کے بعد عبدل سامنے آیا اور چپ چاپ کھڑا ہو گیا، انعام سمجھا، شاید کچھ روپیہ پیسہ کی ضرورت ہے، جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا،

"کیا چاہیئے؟"

"چاہیئے تو کچھ بھی نہیں!"

"پھر؟ ــــ کوئی اور بات؟"

"جی!"

"کہہ ڈالو، کیا بات ہے؟"

"بات تو کچھ بھی نہیں، مگر ایک بات ہے!"

انعام ہنسنے لگا، عبدل نے کہا،

"اسی گاؤں میں چھوٹے سے بڑا ہوا ہوں سرکار، اسی گاؤں کی مٹی کے نیچے پرکھوں کی ہڈیاں دبی ہوئی ہیں!"

"ٹھیک ہے، مگر!"

"اب رنگت کچھ اور ہے!"

"کیا؟ ذرا صاف صاف کہو۔"

"وہ بات نہیں جو پہلے تھی!"

"یعنی؟"

"رسال پور کے ہندوؤں کی آنکھوں میں خون اُترا ہُوا ہے، آپ تو بڑے آدمی ہیں لیکن ہم لوگوں سے وہ چھیڑ چھاڑ کرنے لگے ہیں!"

"کیا؟"

"جب اکیلے دکیلے میں مل جاتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں!"

"کسے؟"

"مسلمانوں کو، جیناصاحب کو!"

"ادنھ ہوگا، ہمیں کیا، مسلمانوں نے نواکھالی میں جو کچھ کیا، اس کے بعد وہ گالی ہی کھانے کے مستحق ہیں، رہے جیناصاحب، انھیں ہندو تو ہندو، بہت سے مسلمان بھی گالیاں دیتے ہیں، یہ ساری آگ لگائی ہوئی کس کی ہے؟ انہی ذات شریف کی!"

"لیکن وہ حضور کو بھی گالیاں دیتے ہیں!"

"تم سنتے کیوں ہو؟ ٹل جایا کرو!"

"وہ چھیڑ چھیڑ کے سناتے ہیں!"

"تو سُنی اَن سُنی کردیا کرو!"

"وہ کچھ اور بھی کہتے ہیں!"

"کیا کہتے ہیں؟"

"کہتے ہیں، ہم نواکھالی کا بدلہ لیں گے!"

"لے تو رہے ہیں، سارے بہار میں فساد کی آگ پھوٹ پڑی ہے!"

یہ کہتے کہتے انعام کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمایاں ہو گئے، عبدل نے پھر، بڑی التجا کے ساتھ کہا،

"میری بات مان لو سرکار!"

"کیا چاہتے ہو تم؟"

"آج کل یہاں نہ رہو، پٹنہ واپس چلو!"

"کیوں!"

"یہاں ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا!"

"تجھے کیسے معلوم؟"

"گوری شنکر، رام نرائن سے کہہ رہا تھا، رسال پور کا ایک مسلمان بھی بچ کے نہیں جا سکتا، سب کو یہیں مار دیں گے۔"

"بکتا ہے!"

"سرکار مان لو میری بات!"

"ابے تُو ڈرتا کیوں ہے؟ نہ جورو نہ جاتا نہ بال نہ بچے، نہ گھر نہ دُر، نہ روپیہ، نہ پیسہ!"

"میرا گھر، در، روپیہ پیسہ، بال بچے سب کچھ آپ لوگ ہیں۔"

"ٹھیک ہے عبدل، مگر تم گھبراؤ مت، اوّل تو یہاں حملہ نہیں ہو سکتا،

کیونکہ مسلمان اس گاؤں میں آدھے سے زیادہ ہیں، مشکل سے دو چار مسلم لیگی ہوں گے، باقی سب کانگرسی ہیں، دوسرے یہ کہ ہم لوگ بزدل اور کمزور نہیں ہیں، میری رائفل دیکھی ہے تم نے؟ ——"

"لیکن رہو گے یہیں؟"

"اچھا دیکھو، میں آج انتصار بھائی سے بات چیت کرتا ہوں!"

"ضرور کرو، اور سویرا ہوتے ہی بس چل دو یہاں سے!"

"اچھا اچھا!"

عبدل چلا گیا اور انعام سوچ میں پڑ گیا، اسے عبدل کی باتوں میں صداقت نظر آئی، اس نے غور کیا، تو محسوس کیا، واقعی گاؤں والوں کے تیور بگڑے ہوئے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن سے پشت ہا پشت سے خاندانی تعلقات ہیں، مگر نہ اب ان میں وہ پہلا سا اخلاص ہے، نہ پہلی سی وضعداری، یہ گھور گھور کے دیکھتے ہیں اور کٹے کٹے رہتے ہیں، نہ وہ میل جول ہے، نہ وہ سبھاؤ اور ملاپ، واقعی اس زمانہ میں یہاں رہنا مناسب نہیں، پٹنہ ہی چلنا چاہیئے، لیکن افتخار خالو کو، انتصار کو، احتشام کو کیا ہو گیا ہے، یہ لوگ کیوں اتنے بے فکر ہیں؟ کیوں خطرہ کو محسوس نہیں کرتے؟ یہاں اخبار نہیں آتا، لیکن ریڈیو پر روز فساد کی تباہ کن خبریں سنائی جاتی ہیں، بہار کے ہر گوشہ میں اس وقت فساد کی آگ بھڑک رہی ہے، پھر یہ رسال پور کب تک محفوظ رہے گا اور ہاں کل، بہار کے ایک ایک دیہات اور ہر ہر شہر میں، یوم نواکھالی بھی تو منایا جا رہا ہے، خدا خیر کرے!

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ احتشام سیر سپاٹے سے فارغ ہو کر پھر واپس آ گیا، اسے دیکھتے ہی انعام نے کہا،

"کچھ خبر بھی ہے؟"

"کوئی نئی خبر؟"

"کل یوم نو اکھالی منایا جا رہا ہے!"

"تو!"

"بڑا خطرناک دن ہے، خدا خیر کرے!"

"اوہو یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا، لائیے ذرا ہاتھ تو بڑھائیے ادھر!"

"یہ کس لیے؟"

"آپ کی نبض دیکھوں گا، ——— بزدل کہیں کے، کہہ دیا رسالپور میں کچھ نہیں ہو سکتا، مگر آپ ہیں کہ ہول دل میں مبتلا ہیں، تم عورت کیوں نہ ہوئے؟"

"میں تو احتیاطاً یونہی کہہ رہا تھا!"

"ہم نے ساری احتیاطیں کر لی ہیں، آپ بالکل فکر نہ کیجئے، چلو کھانا کھائیں بھوک لگی ہے!"

انعام چپ چاپ احتشام کے ساتھ ہو لیا، وہ ڈر رہا تھا کہیں کھانے پر احتشام میرا مذاق نہ اڑائے، لوگ واقعی مجھے بزدل سمجھنے لگیں گے، لہٰذا صورت حال کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا،

"بڑا بے وقوف ہے عبدل بھی!"

"یہ آج معلوم ہُوا، آپ کو؟ ـــــ کیا ہُوا؟"

"ابھی کہہ رہا تھا، رسال پور کا کوئی مسلمان زندہ نہیں بچے گا!"

"میں سمجھ گیا، یہ آپ کا اختلاج، حضرت عبدل شاہ کی پیشین گوئیوں کا نتیجہ ہے؟ بہت خوب!"

انعام نے احتشام کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا،

"پاگل ہوئے ہو؟ میں تمھیں آزما رہا تھا!"

"آزما لیا؟ سچ مچ کہنا، کیسا پایا مجھے!"

"بہادر، نڈر!"

"اب تم پوچھو، میں نے تمھارے بارے میں کیا رائے قائم کی؟"

"کیا رائے قائم کی؟"

"ڈرپوک!"

انعام نے قہقہہ میں بات اڑا دی، اب یہ لوگ ڈرائنگ روم میں پہنچ چکے تھے، میز پر کھانا چنا رکھا تھا، احتشام واقعی بہت بھوکا تھا، بے ہاتھ دھوئے کھانا کھانے بیٹھ گیا،

انعام نے کہا،

"اتنے بھوکے ہو کہ یونہی بیٹھ گئے، ہاتھ بھی نہیں دھوئے؟"

احتشام نے لقمۂ تر منہ میں رکھتے ہوئے کہا،

"اجی ہم تو جان سے ہاتھ دھو چکے ہیں، کھانے کا کیا ذکر؟

"جان سے ؟ کس لیے ؟"

"اگلے ہفتہ یہاں سے تھوڑے فاصلہ پر مسلم لیگ کا ایک جلسہ ہے وہیں ہم نے نیشنلسٹ مسلمانوں کا بھی جلسہ رکھا ہے، دونوں طرف سے زور دار تیاریاں ہو رہی ہیں، دیکھو کیا ہوتا ہے ؟"

انعام کو بزدلی کا داغ دھونے کا موقع مل گیا، اس نے کہا،

"میں بھی چلوں گا!"

نوحۂ غم!

افتخار صاحب ابھی ابھی ظہر کی نماز پڑھ کر مسجد سے آئے تھے۔ مردانہ حصّہ میں بیٹھے حُقّہ پی رہے تھے، انتصار، احتشام اور انعام بھی، ادب سے خاموش سامنے بیٹھے تھے، افتخار صاحب زوردار کش لگا کر، دھواں آہستہ آہستہ چھوڑتے ہوئے احاطہ کے سبزہ زار کو گھورنے لگے، جیسے کسی گم شدہ چیز کا کھوج لگا رہے ہوں، انھوں نے انتصار کی طرف منہ موڑا اور کہا،

"عجب حالت ہو رہی ہے ملک کی، جدھر دیکھو فساد، جہاں دیکھو ہنگامہ"

"جی ہاں ——— کچھ سمجھ میں نہیں آتا، انجام کیا ہوگا، ان باتوں کا!"

"انجام تو دیکھ رہے ہو اپنی آنکھوں سے، اس سے زیادہ کیا ہوگا!"

"بجا ارشاد!"

"مجھے سب سے زیادہ دُکھ بہار کی حالت پر ہوتا ہے یہ وہ صوبہ ہے، جو گاندھی جی کا سب سے زیادہ عقیدت مند ہے جس کو گاندھی جی پر اور جس پر گاندھی جی کو فخر ہے!"

"جی!"

"جس نے عدم تشدّد کی جنگ میں سب سے زیادہ، شان دار اور یادگار پارٹ ادا کیا۔"

"درست!"

"جہاں کانگرس کی تعمیر، قومیت کی تعمیر اور جذبۂ آزادی کی تعمیر میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ حصّہ لیا، آج بھی صوبۂ کانگرس کا صدر ایک مسلمان ہی تھا، اب تک بہار کے کانگرس ہاؤس کا نام "صداقت آشرم" ہے، آزادی کے مشہور مجاہد، مظہر الحق مرحوم کا بنایا ہُوا آشرم، دیا ہُوا نام، ہندو مسلم اتحاد کی جیتی جاگتی تصویر، اردو ہندی کا دل آویز مرکّب ——"

حقّہ کا ایک کش لینے کے بعد، افتخار صاحب نے ایک لمبی سانس لی، اور کہا،

"آج وہی صوبہ فساد کی آگ میں جھلس رہا ہے، تشدد کا سب سے بڑا، مرکز بنا ہُوا ہے، مظہر الحق اور گاندھی کی بنائی ہوئی قوم، آپس میں جھگڑ رہی ہے اور خون کی ندیاں بہا رہی ہے! کیا حشر ہوگا، کیا انجام ہوگا، اس صوبہ کا؟ سوچتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں!"

نوجوان خاموش بیٹھے تھے اور بوڑھا کہہ رہا تھا،

"مسلم لیگ نے جس طرح مسلمانوں کی لٹیا ڈبو دی، کانگرس نے اسی طرح ہندوستان کو کہیں کا نہ رکھا۔"

افتخار کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور آواز بھرّا رہی تھی،

"مسلم لیگ کی حرکتوں کے سبب جس طرح آج مجھے اپنے تئیں مسلمان کہتے ہوئے شرم آتی ہے، اسی طرح کانگرس کے مجاہدوں کا رنگ دیکھتے ہوئے میں اپنے آپ کو کانگرسی کہتے ہوئے شرماتا ہوں!"

احتشام بڑا جوشیلا تھا وہ کانگرس کے خلاف ایک حرف بھی نہیں سننا چاہتا تھا، اس سے خاموش نہ رہا گیا۔

"کیوں، کانگرس نے کیا کیا، ابّا جان؟"

"یہ نہ پوچھو بیٹا! سوچتا ہوں تو دُکھ ہوتا ہے، کہوں گا تو رونے لگوں گا!"

"کچھ تو فرمائیے!"

"میں اوّل و آخر کانگرسی ہوں، کانگرسی ہونے کے سبب اپنی قوم کا معتوب بھی، پھر کن آنکھوں سے دیکھوں کہ آج بہار کے مسلمانوں سے نواکھالی کا جو انتقام لیا جا رہا ہے، اس میں اتنے مہاسبھائی اور غنڈے نہیں، جتنے کانگرسی، کھدر پوش عدم تشدّد کے علمبردار، گاندھی جی کے پرستار!"

"یہ کیسے معلوم ہوا آپ کو؟"

"تم گھر میں بیٹھے ہو، کچھ نہیں جانتے، میں باہر نکلتا ہوں، پہروں باہر رہتا ہوں میلوں پیدل چلتا ہوں، مجھے سب کچھ معلوم ہے، کاش اس لمبے چوڑے ملک میں ایک چھوٹی سی جگہ ایسی ہوتی، جہاں ہندو مسلمان مل کر رہتے اور نمونہ کا ہندوستان بنا سکتے! میرا جی تو اب اکتا تا جا رہا ہے، مسلمانوں سے، ہندوستان سے، آخر نواکھالی کے مظالم کا بدلہ بہار کے مسلمانوں سے کیوں لیا جا رہا ہے اور کب تک لیا جاتا رہے گا یہ بدلہ؟"

"جی یہ تو ٹھیک ہے مگر! ——"

"یاد رکھو، کانگرس ہندوؤں کی نہیں ہے، مسلمانوں کی بھی ہے، اس کی تعمیر میں مسلمانوں نے ہندوؤں سے زیادہ حصّہ لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم اس کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں، ہم اپنے کارناموں کو جاری رکھنا چاہتے ہیں، ان پر پانی پھیرنا ہرگز نہیں چاہتے!"

احتشام نے جوش کے ساتھ کہا،

"بیشک، اسی لیے ہم کانگرس میں شریک ہیں اور شریک رہیں گے!"

افتخار نے گویا کچھ سنا ہی نہیں، سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"کانگرس کا فرض تھا کہ وہ نواکھالی کے مظلومین کے لیے انصاف طلب کرتی اور بہار کے مسلمانوں کو ظلم سے بچاتی، لیکن اس کے کارکن اور بعض لیڈر، کھلم کھلا انتقام کی تلقین کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو مظلوم بنانے پر تلے ہوئے ہیں!"

"ابّا جان میں اس مسلم لیگی پروپیگنڈے پر ذرا بھی اعتبار نہیں کرتا!"

"بیٹے، یہ مسلم لیگی پروپیگنڈہ نہیں ہے، میں مسلم لیگ سے نفرت کرتا ہوں لیکن مسلم قوم سے نفرت کیسے کرنے لگوں؟ میں کانگرسی ہوں اور مجھے اپنے کانگرسی ہونے پر ناز ہے، لیکن میرا فخر و ناز اب کانگرسیوں ہی کے ہاتھوں چھنتا جا رہا ہے، وہ میری نہیں سنتے، وہ نیک بات نہیں سنتے، انھیں اپنی قوت اور طاقت پر گھمنڈ ہے، میں کیا کروں، خودکشی کے سوا کوئی دوسری تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔"

یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے ڈھلکنے لگے سب ہی متاثر تھے، لیکن احتشام اب تک لڑے جا رہا تھا، اس نے اس مغموم فضاء سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"ابا جان، آپ اتنے مایوس کیوں ہوتے ہیں؟ کانگرس سے بددل کیوں ہوئے جاتے ہیں؟ یہی ایک ادارہ ہے جہاں ہندو اور مسلمان مل کر بیٹھتے ہیں، اور بیٹھ سکتے ہیں، اس کو چھوڑ دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے ہندوستان کی آزادی اور قومیت متحدہ کا تصور چھوڑ دیا، نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا، کانگرس ہماری ہے، ہم اسے کبھی نہیں چھوڑ سکتے!"

"کب کہتا ہوں کہ اسے چھوڑ دو، میں تو یہ رو رہا ہوں کہ ہم کانگرس کو چھوڑ بھی نہیں سکتے اور اس کی غلط روی کی اصلاح بھی نہیں کر سکتے، پھر کریں کیا، سوچا یہ ہے!"

اختتام کچھ جواب دینے والا تھا کہ دفعتہً ایک عجیب قسم کے شور و غل کی ہولناک اور لرزہ خیز آواز بلند ہوئی، ایسا معلوم ہوا جیسے کسی بہت بڑی فوج نے دفعتہً دشمن کے کسی شہر پر ہلّہ بول دیا ہے، عورتوں کی چیخنے کی، بچوں کے رونے کی، اللہ اکبر اور جے ہند کی آوازیں لحہ بہ لحہ بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں، سب لوگ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے، افتخار صاحب نے کہا۔

"کیا معاملہ ہے؟ یہاں بھی کوئی ہنگامہ ہو گیا کیا؟"

اتنے میں عبدل ہانپتا، کانپتا آیا، چہرہ زرد، قدموں میں لرزش، حواس پراں، اُسے اس حال میں دیکھ کے انتصار نے کہا،

"کیا ہے؟"

"آ گئے، ہائے اللہ!"

"کون آ گئے؟"

"ہندو ـــــ مارے ڈال رہے ہیں سب کو ـــــ"

"سب کو؟"

"جی! ـــــ سب کو ـــــ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں، بھاگو میاں، جلدی کرو، اِدھر بھی ایک گروہ آ رہا ہے۔"

افتخار نے کڑک کر کہا،

"آنے دو، ہم بھاگ نہیں سکتے، جسے ہمارے ساتھ مرنا ہو، وہ ٹھہرے، جسے اپنی جان عزیز ہو وہ بھاگ جائے!"

پھر انھوں نے انعام سے کہا،

"تم اندر جاؤ، عبدل بھی تمھارے ساتھ جائے گا، عورتوں کی حفاظت تمھارے ذمہ ہے، یہاں ہم بھگت لیں گے!"

شور و غل قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا، ایسا معلوم ہوا، لوگ دیوان خانہ میں گھس آئیں گے، یہ لوگ باہر نکلے تو دیکھتے کیا ہیں، ایک جم غفیر، تلواروں، بلموں، نیزوں، برچھیوں، کٹاروں اور لاٹھیوں سے مسلح موجود ہے۔ اس مجمع میں گاؤں کے لوگ بھی تھے اور گاؤں سے باہر کے لوگ بھی، گاؤں بھر میں مسلمانوں کی تعداد، ڈھائی تین سو سے زیادہ نہ تھی، اور یہ مجمع کسی طرح ۱۰-۱۲ ہزار سے کم نہیں تھا، گوری شنکر اور رام نرائن سب سے آگے تھے، یہ وہ لوگ تھے، جو افتخار کو چچا کہا کرتے تھے، مقامی کانگرس میں جن کی سربلندی رہین منت تھی، افتخار چچا کی بزرگانہ شفقت اور حوصلہ افزائی کی۔ افتخار نے گوری شنکر سے کہا،

"کیا ہے بھئی، یہ ہنگامہ کیسا ہے؟"

وہ مسکرایا، اس نے حقارت اور نفرت کی نظر، اپنے منہ بولے چچا، اور

چچازاد بھائیوں پر ڈالی، اور زہر خند کرتے ہوئے کہا،

"ہنگامہ تو ختم بھی ہو گیا!"

"شاباش! تم سے یہی امید تھی، تمھیں یہی کرنا چاہیئے تھا، اب میں رونے اور چیخنے کی آوازیں نہیں سن رہا ہوں، اچھا کیا تم نے ہنگامہ ختم کرا دیا ــــ"

گوری شنکر نے بات کاٹتے ہوئے کہا،

"ہنگامہ میں نے نہیں ختم کرایا، بلکہ ختم ہو گیا!"

"وہ کیسے؟"

"بتا دوں چاچا؟"

"ہاں ہاں بتاؤ!"

"ٹھکانے لگا دیا ہم نے سب کو، تو اب روئے چیخے گا کون؟"

"ٹھکانے لگا دیا؟"

"ہاں چاچا!"

"کیسے؟"

"تمام مسلمانوں کو، گاؤں کے تمام مسلمانوں کو!"

"گاؤں کے تمام مسلمانوں کو؟"

"ہاں سب کو، بس تمھارا گھر باقی رہ گیا ہے چاچا، سو وہ بھی ابھی ابھی ٹھکانے لگ جائے گا!"

رام نرائن نے گوری شنکر سے کہا،

"ابھی نہیں!"

"پھر کب؟"

"تھوڑی دیر کے بعد!"

"کیوں؟"

"ذرا چاچا کو، گاؤں کی سیر تو کرا دو۔"

"ہاں یار یہ ٹھیک رائے ہے! ——— چلو چاچا!"

"چلو!"

انتشار اور احتشام بھی ساتھ چلنے پر تیار ہوئے، رام نرائن نے ان کی طرف بڑھ کر کہا،

"اونھ ہوں، تم نہیں جا سکتے!"

احتشام جھنجھلا گیا، اس نے کہا،

"ہم ضرور جائیں گے!"

رام نرائن برچھی تان کر کھڑا ہو گیا،

"خبردار جو ایک قدم بھی آگے بڑھایا!"

افتخار نے احتشام سے کہا،

"ضد نہ کرو جو کچھ ہونا ہوگا، وہ میرے سامنے بھی ہو سکتا ہے اور پیچھے بھی، تم لوگ یہیں رہو!"

احتشام خاموش ہو گیا، انتشار پہلے ہی خاموش کھڑا تھا، افتخار صاحب گوری شنکر اور مجمع کے چند آدمیوں کے ساتھ روانہ ہو گئے، گھر کے اندر موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا اور باہر ایک خون آشام لیکن منظم مجمع ضبط و نظم کی

پوری شان کے ساتھ کھڑا تھا۔

گوری شنکر سب سے پہلے افتخار صاحب کو لے کر عثمان کے گھر پہنچا، یہ ایک مسلم لیگی نوجوان تھا، دروازہ پر اس کی لاش قیمہ قیمہ کی ہوئی پڑی تھی، جوتوں کا ہار زیبِ گلو تھا، ہار کی طرف اشارہ کر کے گوری شنکر نے کہا،

"یہ نہرو جی نے بھیجا ہے!"

پھر خود ہی، مزید تشریح کی،

"یہ وہ ہار ہے جو اس نے پنڈت جی کی تصویر کو پہنایا تھا!"

افتخار صاحب خاموش رہے، اس نے کہا،

"اندر کی بہار تو دیکھو چل کر!"

سب لوگ اندر پہنچے۔

عثمان کی نوجوان بیوی بالکل عریاں حالت میں مری ہوئی پڑی تھی، اس کے پستان کاٹ دیے گئے تھے اور سر میں کیلیں ٹھکی ہوئی تھیں، پاس ہی اس کا اکلوتا ننھا سا بچہ بے جان پڑا تھا، سر الگ، دھڑ الگ، پاؤں الگ۔

یہ منظر دیکھ کر افتخار کا دل چیخ اٹھا، مگر وہ ضبط کیے رہا، گوری شنکر نے کہا،

"چلو!"

اب یہ لوگ حاجی تخمل حسین کے گھر پہنچے، گھر کھنڈر بن چکا تھا، حاجی صاحب کے دو الگ الگ ٹکڑے صحن میں پڑے تھے، یہ لوگ دالان میں پہنچے، وہاں ان کی بیوی، بہن الٹی لٹکی ہوئی تھیں چھت سے، اور گردن غائب تھی، گوری شنکر نے کہا،

"آگے چلو!"

اب یہ لوگ ماسٹر سخاوت حسین کے گھر پر پہنچے، جہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا، گوری شنکر نے کہا،

"اندر جا کر کیا کرو گے چاچا، جلا دیا سب کو، بھسم ہو گئے ہوں گے، اب تو ——— آؤ آگے چلیں!"

افتخار نے قدم آگے بڑھایا تھا کہ سخاوت کا چھوٹا بھائی، ذکاوت، جو نہ جانے کس طرح جلنے سے محفوظ رہ گیا تھا، بھاگتا ہوا آیا اور افتخار کے پیروں سے لپٹ گیا، روتے روتے اس نے کہا،

"سارا گھر جل گیا، مجھے تو بچا لیجئے!"

قبل اس کے کہ افتخار صاحب جواب دیں، گوری شنکر کے بھرپور ہاتھ نے اس کی گردن اڑا دی، اس کی گردن خاک پر لوٹنے لگی۔ گوری شنکر نے اپنے ساتھیوں سے کہا،

"یہ مسلم لیگی پلا بڑا سخت جان تھا!"

گوری شنکر نے جب مسلم لیگیوں کے تمام گھر کھنڈر کی صورت میں دکھا لیے اور یکیوں بے گور و کفن لاشوں کا نظارہ کرا لیا تو وہ اس حصّہ کی طرف مڑا، جہاں نیشنلسٹ اور کانگرسی مسلمان رہتے تھے، یہاں آ کر افتخار نے دیکھا کہ ایک ایک گھر کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہے، ایک ایک عورت، ایک ایک بچّہ، ایک ایک مرد قتل ہو چکا ہے، سب کی لاشیں، سر بریدہ، اور اعضاء شکستہ پڑی ہوئی ہیں، کسی کے گلے میں جوتے کا ہار پڑا ہے، کسی کے منہ

میں غلاظت بھری ہوئی ہے، افتخار نے یہ ہولناک منظر دیکھ کر کہا،

"یہ لوگ تو مسلم لیگی نہیں تھے؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے، مسلمان تو تھے۔"

"ٹھیک کہتے ہو، اس کا مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا!"

"چلو چاچا، اپنے گھر چلو زیادہ باتیں نہ کرو!"

ایک ساتھی نے گوری شنکر سے کہا،

"ارے ابھی سے چل رہے ہو!"

"پھر؟ اب کیا کام باقی ہے؟"

"اور وہ مینا بازار!"

گوری شنکر نے افتخار سے کہا،

"ہاں چاچا، ذرا مینا بازار کی سیر تو کر لو!"

یہ لوگ، مولوی یحییٰ کی حویلی میں پہنچے، مولوی یحییٰ، ایک عربی مدرسہ کے معلّم تھے اور جمیعتہ علماء دہلی کی تقلید میں، بڑے پکّے کانگرسی تھے۔

دروازہ پر مولوی صاحب کی لاش، مہمانوں کے استقبال کے لیے موجود تھی، اندر پہنچ کر جو منظر افتخار صاحب نے دیکھا، اس نے ان کے دل کے ٹکڑے کر دیے، مگر واہ رے استقلال، کیا مجال جو کہیں سے کمزوری ظاہر ہونے دی ہو، انھوں نے دیکھا، گھر کے اندر ۳۰، ۴۰ نوجوان، گل اندام اور خوب رو لڑکیاں رسیوں سے جکڑی ہوئی، نیم عریاں، کپڑے پھٹے ہوئے، بال پریشان، چہرہ اداس، آنکھوں سے جوئے اشک رواں، منہ پر خوف اور

دہشت کے آثار نمایاں، بے بسی اور بے کسی کے عالم میں کھڑی ہوئی ہیں۔
گوری شنکر نے ان کی طرف دیکھ کر کہا،

"یہ ہے مینا بازار!"

افتخار نے کوئی جواب نہیں دیا، نظر اٹھا کر دیکھا، توصف کے آخر میں نزہت بھی کھڑی تھی۔ باپ کو دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، افتخار نے حقارت اور نفرت کی نظر اس پر ڈالی اور کہا۔

"جب تم ناموس کے لیے اپنی جان بھی نہ دے سکیں، تو باپ سے کیوں امید کرتی ہو کہ وہ تمھیں بچائے گا؟"

"بچا بھی تو نہیں سکتا۔"

"بچا سکتا ہوتا، تو بھی نہ بچاتا، میرا مطلب یہ تھا!"

گوری شنکر نے کہا،

"چاچا!"

افتخار نے کوئی جواب نہ دیا، وہ بولا،

"تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے، پہلے تم لونڈیاں رکھا کرتے تھے، اب ہم رکھیں گے، ہم انھیں بیچیں گے، ہم ان کی آبرو لیں گے، ہم انھیں چکلوں میں بٹھائیں گے اور اگر یاروں میں سے کسی کا، کسی پر دل آگیا، تو اسے شادی کی اجازت بھی دے دیں گے، نواکھالی کی مظلوم عورتوں کا بدلہ ہم ان پریوں سے لیں گے،

پھر وہ اپنے ایک ساتھی درگا پرشاد سے مخاطب ہوا،

"یار بس؟ ڈھائی تین سو گھروں میں سے اتنا ہی مال نکلا؟ کہیں کچھ پار تو نہیں کر دیا؟"

"پار کرنے کا موقع کہاں تھا (نزہت کی طرف اشارہ کر کے) اسے پار کرنے کا ارادہ ہے بھئی، مال کم لیوں ہے کہ بہت ساری عورتیں کنوئیں میں چھلانگ لگا گئیں، جو بچ رہیں وہ حاضر ہے ——— تمہارے چچا (افتخار کی طرف اشارہ کر کے) کے ہاں کنواں نہیں تھا، لیکن دو جوان حفاظت کے لیے موجود تھے، ایک کے ہاتھ میں بندوق تھی، دوسرے کے ہاتھ میں تلوار، جیسے ہی ہم لوگ اندر پہنچے، بجائے اس کے کہ وہ دونوں ہم سے لڑتے، بندوق اور تلوار اپنی عورتوں پر چلانے لگے، سب مر گئیں کلمہ پڑھتی ہوئی، ایک تگ (نزہت) کی طرف اشارہ کر کے) بچا، وہ یہاں پہنچا دیا گیا، لیکن کہے دیتا ہوں، اس کا مالک میرے سوا، کوئی اور نہیں ہو سکتا! ہاں!"

"اچھا اچھا دیکھا جائے گا ——— چاچا کے سامنے ایسی باتیں مت کرو ———"

وہ خاموش ہو گیا۔

گوری شنکر نے افتخار سے کہا۔

"بڑی دیر ہو گئی ہے چاچا، چلو، اب تمہارا بھی کریا کرم کر دیں۔"

افتخار نے خاموشی کے ساتھ حکم کی تعمیل کی اور چل کھڑا ہوا، گھر کے دروازہ پر جب پہنچا تو یہ دیکھ کر حیرت کی حد نہ رہی کہ اتنی سی دیر میں کوٹھی کا حلیہ بگڑ چکا ہے، شکست و ریخت کے آثار ہر جگہ سے نمایاں ہیں اور

ایک مرگ آسا سکوت طاری ہے ساری کوٹھی پر گوری شنکر کو دیکھتے ہی رام نرائن لپکا، اس نے کہا،

"بڑی دیر کردی!"

"چاچا کو سیر کرا رہا تھا!"

"اب یہاں کی سیر بھی جلدی سے کراؤ، پھر ہم لوگوں کو، دوسرے گاؤں پر دھاوا بولنا ہے۔"

"چلو بھئی!"

یہ لوگ اندر آئے، جہاں انتصار اور احتشام کھڑے ہوئے تھے، وہاں اب ان کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں، لیکن معلوم ہوتا تھا، یہ لوگ خاموشی سے نہیں مرے مقابلہ کرکے مرے، کیونکہ پاس ہی تین لاشیں اور پڑی ہوئی تھیں جو ہندوؤں کی تھیں، گوری شنکر نے رام نرائن سے پوچھا،

"یہ کیسے مرے؟"

"یہ تو جنگ میں ہوتا ہی ہے!"

"لڑائی ہوئی تھی؟"

"ہاں تھوڑی سی!"

اب یہ لوگ اندر پہنچے، ایک طرف عابدہ کی لاش پڑی تھی، گولی اس کا سینہ توڑتی ہوئی نکل گئی تھی، معلوم ہوتا تھا سب سے پہلے انعام نے اسی کا خاتمہ کیا، ایک طرف انتصار کی بیوی مع اپنے بچّہ کے تلوار سے کٹی ہوئی پڑی تھی، شاید یہ عبدل کا کارنامہ تھا، مرتے مرتے بھی وفاداری کا جوہر دکھا گیا،

اس کے پاس نزہت کی ماں مری ہوئی پڑی تھی، شاید یہ بھی انعام کی بندوق کا شکار ہوئی تھیں، کیونکہ کوئی زخم نظر نہیں آ رہا تھا، ذرا فاصلہ پر عبدل اور انعام کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے اور ان کے قریب دس پندرہ لاشیں ہندوؤں کی، یہ دیکھ کر گوری شنکر کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، اس نے کہا،

"یہ کیا؟"

"لڑائی ہوئی تھی بھئی اور کیا!"

"دو آدمیوں نے اتنے آدمی مار لیے؟"

"اتفاق ہے، دونوں جوان تھے اور مسلح بھی!"

افتخار کے چہرہ پر مسرّت کی سرخی دوڑ رہی تھی، گوری شنکر کے اشارہ سے وہ گھیرے میں لے لیے گئے، انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا،

"ایک بوڑھے آدمی کے لیے اتنے اہتمام کی کیا ضرورت ہے ——— میں بڑی خوشی سے مرنے کو تیار ہوں!"

رام نرائن نے پوچھا،

"تلوار سے یا بندوق سے؟"

"جس طرح تم چاہو!"

گوری شنکر نے کہا،

"دیکھتے کیا ہو، اپنا کام کرو!"

افتخار نے گوری شنکر سے کہا،

"مرنے سے پہلے ایک بات کہنا چاہتا ہوں!"

"کہو!"

"تم مجھے چاچا کہتے تھے، مَیں تمھیں بیٹا کہتا تھا!"

"چھوڑو ان باتوں کو۔"

"سُن تو لو سُن لینے میں کیا حرج ہے!"

"اچھا کہو!"

"نزہت تمھیں بھیّا کہتی تھی، تم اسے اپنی بہن سمجھتے تھے، آج تم جو کچھ کر رہے ہو، کل اس پر پچھتاؤ گے، لیکن اگر نزہت کی لاج چلی گئی تو تمھاری مردمی پر حرف آ جائے گا، مرد، بہن کی لاج کی حفاظت کرتا ہے، اس کے لیے جان دے دیتا ہے، میری جان لے لو، میرے بچّوں کی جان لے چکے، لیکن جسے تم بہن کہہ چکے ہو، اس کی لاج تمھارے ہاتھ ہے، گوری شنکر تم اسے مار ڈالو، تو مجھے ذرا بھی صدمہ نہ ہوگا، لیکن لاج!——"

جملہ ناتمام تھا کہ رام نرائن نے تلوار کا ہاتھ جو چلایا ہے، تو افتخار صاحب مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔ ایڑیاں رگڑیں، کچھ بڑبڑائے، اللہ کا نام تو صاف سنائی دیتا تھا اور ایک دو ہچکیاں لے کر ٹھنڈے ہو گئے۔

مجمع جے ہند کے نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھ گیا، لیکن گوری شنکر کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے، کیوں؟

پھر سفر

تنویر اپنے کام میں لگا ہوا تھا، اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ نواکھالی کے مسلمانوں میں پشیمانی کا جذبہ پیدا کردے، انھیں تلافی مافات پر آمادہ کردے اور ایسی فضا پیدا کردے، کہ پھر اس طرح کے واقعات کا صدور ناممکن ہوجائے اپنے مقصد میں وہ آہستہ آہستہ کامیاب ہو رہا تھا، لیکن بہار کی آتش فساد نے ایک طرف مشرقی بنگال میں پھر ہلچل پیدا کردی تھی، دوسری طرف اس کے دل کی دنیا میں بھی ہلچل مچی ہوئی تھی، وہ جب تک نواکھالی نہیں پہنچا تھا نزہت سے بہت خفا تھا، لیکن یہاں آنے کے بعد، سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اسے نزہت کی سچائی کا اندازہ ہوا، وہ اب دل ہی دل میں نادم تھا اور نزہت سے ملنے کے بہانے ڈھونڈھ رہا تھا، بہار کے قیامت خیز فسادات نے اور زیادہ پریشان کردیا تھا۔

ایک روز وہ حاجی جمال سے جو نواکھالی کے قریب ایک چھوٹے سے موضع میں رہتے تھے اور اپنے حلقہ میں بڑے بااثر تھے، باتیں کر رہا تھا، اس نے کہا،

مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اخبارات کا اور بعض کانگرسی لیڈروں کا پروپیگنڈا بالکل غلط تھا، نو اکھالی کا فساد محدود تھا، موتیں بھی کم ہوئیں، اغوا جبری تبدیلی مذہب کے واقعات تو اِکّا دُکّا ہیں ——— پھر بھی آپ کو یہ تو ماننا پڑے گا کہ ہندوؤں پر ظلم ہُوا، مسلمانوں نے کیا، اور یہ بڑی بُری بات تھی!"

حاجی صاحب نے بے رخی اور برہمی کے عالم میں جواب دیا۔

"ہاں ہاں سب کچھ معلوم ہے، چھوڑیئے اس قصّہ کو کچھ اور باتیں کیجئے!"

تنویر کے لیے حاجی صاحب کا یہ لب ولہجہ بالکل نیا تھا، وہ اس سے بڑے اخلاق و تپاک سے پیش آتے تھے، اس کی بڑی عزت کرتے تھے، اس کے اشاروں پر چلتے تھے، پھر آج انھیں یہ کیا ہوگیا ہے؟ اس نے حیرت کے ساتھ ایک نظر ان پر ڈالی اور پوچھا،

"کچھ خفا ہیں آپ؟"

"نہیں بہت خوش!"

"آپ ضرور خفا ہیں!"

"ارے میاں، خوش ہوں، بہت خوش ہوں، آج چراغاں کروں گا، گھی کے چراغ جلاؤں گا!"

"کیوں؟"

"بہار میں ناکردہ گناہ مسلمانوں سے جو بدلہ سود در سود سمیت لیا جا رہا ہے، جس طرح ہزاروں مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے، عورتیں بے آبرو کی گئیں بچے ماؤں کے سامنے ذبح کیے گئے، نوجوان لڑکیوں کا سینکڑوں کی تعداد میں

اغوا کیا گیا، انھیں مذہب بدلنے پر مجبور کیا گیا، جبراً ان کی شادی ہندوؤں کے ساتھ کر دی گئی، اور یہ سب کچھ اب تک جاری ہے، اس پر گھی کے چراغ نہ جلاؤں گا، تو کیا ماتم کروں گا بیٹھ کر!"

حاجی صاحب نے بات ختم کر کے دیوانوں کی طرح ایک خوفناک قہقہہ لگایا، اور دفعتہً سنجیدہ ہو کر کہا،

"کام کرنا ہے تو بہار جاؤ، گاندھی جی کو وہاں لے جاؤ، یہاں سب خیریت ہے۔"

تنویر نے خیال کیا، جس طرح نواکھالی کی خبریں بڑھا چڑھا کر شائع کی گئی تھیں اسی طرح بہار کے واقعات بھی مبالغہ اور رنگ آمیزی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں، اس نے حاجی صاحب کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بہار سے جو خبریں آ رہی ہیں وہ کافی تشویش انگیز ہیں، لیکن ہر خبر سچ نہیں ہوتی، بہار کی خبروں میں بھی کافی مبالغہ سے کام لیا جا رہا ہے!"

حاجی صاحب نے تنویر کے چہرہ پر نفرت و حقارت سے بھری ہوئی ایک نظر ڈالی اور کہا،

"کیا بکتے ہو تم؟ اگر کچھ نہیں جانتے تو خاموش رہو، خواہ مخواہ سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟"

تنویر نے کہا،

"نواکھالی کے واقعات بھی تو مبالغہ کے ساتھ اخباروں میں شائع ہو رہے تھے۔"

"ہاں ہوئے تھے تو؟"

"اسی طرح بہار کے شائع ہو رہے ہیں!"

حاجی صاحب بڑے غصّہ میں تھے، اس وقت انھوں نے، تہذیب و متانت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے عقل کے دشمن، ذرا بات سے کہنے سے پہلے آگا پیچھا تو سوچ لیا کرو!"

یہ الفاظ تیر کی طرح، تنویر کے دل پر لگے، لیکن وہ ضبط کر گیا، اس نے کہا،

"آپ نے یہ کیسے جانا کہ میں بے سوچے سمجھے بات کرتا ہوں؟"

"بتاؤں؟"

"فرمائیے!"

"نواکھالی کے واقعات کس نے شائع کرائے تھے اخباروں میں؟"

"خبر رساں ایجنسیوں نے!"

"یہ ایجنسیاں کس کی ہیں؟"

تنویر کچھ دیر خاموش رہا، پھر اس نے کہا،

"زیادہ تر ہندوؤں کی!"

"بہار کے واقعات کون مشتہر کر رہا ہے؟"

"وہی ایجنسیاں!"

"تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہندو ایجنسیاں ہندوؤں کے ظلم و ستم کے واقعات مبالغہ کے ساتھ شائع کرائیں گی؟"

اس جرح پر تنویر خاموش ہو گیا، وہ کچھ سوچ رہا تھا کہ حاجی صاحب نے اپنی ڈراؤنی اور خوفناک آنکھوں کو تنویر کے چہرے پر جما کر کہا،

"میرا بھائی کل ہی بہار سے واپس آیا ہے، وہاں ایک قصبہ میں اس کی دوکان تھی، ہوزری کی!"

"جی!"

"معلوم ہے کس طرح آیا ہے؟"

"جی نہیں!"

"بیوی کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے زنا کاری کی گئی، پھر اسے قتل کر دیا گیا، اس کی دو لڑکیوں کو بلوائیوں کے حوالہ کر دیا گیا کہ وہ انھیں ہندو بنا ڈالیں، معصوم اور ننھے بچے کو قیمہ قیمہ کر دیا گیا، اس کی دوکان لوٹ لی گئی، اس کا گھر جلا دیا گیا، یہ سلوک صرف اسی کے ساتھ نہیں ہوا، قصبہ کے ہر مسلمان کے ساتھ خواہ وہ مسلم لیگی ہو یا کانگرسی، یہی سلوک کیا گیا، خود میرے بھائی کو مارتے مارتے ادھ موا کر دیا گیا، اس کے سینہ اور پیٹھ پر کئی زخم ہیں، بلوائی اسے مار ہی چکے تھے، قسمت تھی نہ جانے کس طرح گرتا پڑتا شہر پہنچا، اور وہاں سے ایک قافلہ کے ساتھ یہاں آیا، وہ اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ شاید ہی بچے، پھر بیوی بچوں کا غم اسے اور مارے ڈال رہا ہے، سمجھے میاں صاحبزادے یہ حال ہے بہار کا، بہار کے کانگرسیوں کا!"

"کانگرسیوں کا؟"

"جی جناب!"

"یہ آپ کو کیسے معلوم ہُوا؟"

"یہ بلوائی، مکرجی اور ساورکر کی جے نہیں بولتے تھے، ان میں بہت سے لوگ کھدر پوش تھے اور تقریباً سب گاندھی اور نہرو کی جے بولتے تھے!"

"تعجب ہے!"

"تعجب کا ہے کا، ڈوب مرو چلّو بھر پانی میں، اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو، اور دشمنوں سے ملے ہو!"

"جی میں؟"

"ہاں جناب آپ ـــــ خیریت چاہتے ہو، تو بوریہ بستر باندھو یہاں سے، ورنہ کسی دن ایک کے دو نظر آؤ گے، آ گیا خیال میں!"

"آپ اس وقت بہت برہم ہیں، اجازت چاہتا ہوں، پھر حاضر ہوں گا!"

"جائیے، اور اب کبھی تشریف نہ لائیے گا ہیں تم جیسے غداروں کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا، بے ایمان کہیں کے، کانگرس کے نمکخوار!"

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید تنویر ان باتوں کو بالکل برداشت نہ کرتا، مرنے مارنے پر تیار ہو جاتا، لیکن اب اس میں قوتِ برداشت زیادہ پیدا ہو گئی تھی، وہ پی گیا ان باتوں کو، اس نے جاتے جاتے کہا،

"آپ بے ایمان اور کانگرس کا نمک خوار کہہ کر ظلم کر رہے ہیں مجھ پر!"

"آؤ پھر ہو جائیں دو دو ہاتھ، یا تو تم ظالم کو مار ڈالو، یا ظالم تمھارا خون چوس لے!"

"آپ میرے بزرگ ہیں، آپ کے ساتھ کوئی گستاخی نہیں کر سکتا۔"

"سر تو جھکا دو، پٹنے کے لیے!"

"سر حاضر ہے، صرف سر ہی نہیں جان بھی!"

حاجی صاحب نے دیکھا، ان کی تلخ اور درشت باتوں کو بھی، تنویر برخوردانہ سعادت مندی کے ساتھ برداشت کر رہا ہے، اب وہ ذرا ٹھنڈے پڑے، انھوں نے کہا،

"میاں جس پر گزرتی ہے اسی کا دل جانتا ہے، تم میری جگہ ہوتے، اور تمھارا بھائی اس طرح لٹ کر آیا ہوتا، تو شاید تم منہ کے بجائے تلوار سے بات کرتے!"

"آپ صحیح فرماتے ہیں، واقعی بڑے صبر سے کام لے رہے ہیں آپ، میں شاید اتنا صبر نہ کر پاتا ــــ"

"پھر کہتا ہوں، یہاں کی فکر نہ کرو، یہاں اب ہندوؤں پر ظلم نہیں ہو سکتا کام کرنا ہے تو بہار جاؤ۔"

"آپ کی اس ہدایت پر عمل کروں گا اور جلد بہار جاؤں گا، میرے بھی وہاں عزیز ہیں اور مجھے فکر ہو رہی ہے کہ ان کا حشر کیا ہوا؟"

"کہاں ہیں وہ؟"

"بہار میں!"

"شہر میں یا دیہات میں؟"

"کچھ شہر میں، کچھ دیہات میں!"

"جو شہر میں ہیں وہ تو شاید صحیح سالم ہوں، باقی دیہات کے عزیزوں

پر یہاں سے فاتحہ پڑھ کر جاؤ!"

"سب قتل ہو گئے ہوں گے؟"

"قطعاً ـــــ مشکل سے کسی دیہات کے مسلمان محفوظ رہے ہوں گے، سوا ان مقامات کے جہاں وہ بہت بڑی اکثریت میں تھے، یا مسلح تھے، یا پہلے سے بچ نکلے تھے!"

اب تنویر پر وحشت طاری ہو رہی تھی وہ جلد از جلد پٹنہ پہنچنا چاہتا تھا قیام گاہ پر آیا، تو تازہ ڈاک آئی ہوئی رکھی تھی، یہ تازہ ڈاک بھی دو تین دن پہلے کی تھی، کیونکہ آج کل اخبارات لیٹ ہو کر آیا کرتے تھے، اس نے جلدی جلدی امرت بازار پتریکا کا ایک پرچہ اٹھایا اور پڑھنا شروع کیا۔

اس پرچہ میں، پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک بیان نظر سے گزرا، جس میں انھوں نے اعتراف کیا تھا کہ بہار میں مسلمانوں پر سخت ظلم ہو رہا ہے، پھر انھوں نے تشدد پسند بلوائیوں کو متنبہ کیا تھا کہ وہ اگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے، تو ان پر مشین گن چلائی جائے گی اور انھیں پُر امن رہنے پر مجبور کیا جائے گا۔

بیان پڑھ کر تنویر کے کان کھڑے ہوئے، اس نے محسوس کیا، صورت حال تصور سے کہیں زیادہ نازک ہے، حالات اتنے ہی نازک ہو چکے ہوں گے کہ پنڈت نہرو نے مشین گن چلانے کی دھمکی دی، ورنہ کانگرسی لیڈر، اور عدم تشدد کا ہیرو، ایسی مہلک چیز کا نام زبان پر کیوں لاتا! اس نے سوچا مجھے جلد از جلد پٹنہ روانہ ہو جانا چاہیئے۔

پھر اس نے آنند بازار پتریکا کا ایک نمبر اٹھایا، اس میں گاندھی جی کے

بارے میں ایک خبر درج تھی کہ انھوں نے فیصلہ کرلیا ہے، اگر بہار میں مسلمانوں کے قتل عام کا سلسلہ بند نہ ہوا، تو وہ مرن برت شروع کردیں گے اور اپنی جان دے دیں گے، یہ خبر پڑھ کر تنویر حواس باختہ ہوگیا، اس نے سوچا، بہار کے مسلمانوں پر واقعی قیامت ٹوٹ رہی ہے، حالات قابو سے باہر ہوچکے ہیں، اس نے فیصلہ کرلیا کہ مجھے فوراً جانا چاہیئے، ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا چاہیئے۔

آنند بازار کا پرچہ اس نے ایک طرف پھینکا اور کچھ سوچ کر اٹھا تھا کہ اس کی نظر کانگرسی روزنامہ ہند پر پڑی، کھڑے کھڑے وہ اسے پڑھنے لگا، اس میں مولوی فضل الحق صاحب کا بیان نظر سے گزرا جس میں انھوں نے بسط و تفصیل سے کام لے کر، اپنے دورۂ بہار کے درد انگیز، لرزہ خیز، ہولناک اور جان گسل مشاہدات بیان کیے تھے، یہ بیان پڑھ کر وہ رو دیا، اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، اس نے دل ہی دل میں کہا یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیسی قیامت گذر رہی ہے! ایں چہ می بینم بیدار است یارب یا بہ خواب!

اس نے جلدی جلدی اپنا مختصر سا سامان سفر باندھا اور بغیر کسی سے ملے جُلے، بغیر کسی سے کچھ کہنے سُننے، چل پڑا، اس کی نظر کے سامنے افتخار چچا، اغتشام، انعام اور انتصار کی تصویر پھر رہی تھی، وہ سوچ رہا تھا، ان کا کیا حشر ہوا ہوگا؟ ——— اور نزہت؟ کس عالم میں ہوگی؟ اس کے دل کی کیفیت کیا ہوگی، یا کہیں ان لوگوں پر بھی کوئی آفت نہ آگئی ہو، پٹنہ میں بھی تو فساد ہو رہا ہے! پھر اس نے اپنے دل کو تسلی دی، پٹنہ میں